

تاریخ کی روشنی

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ کی روشنی

ڈاکٹر مبارک علی



فکشن ہاؤس



18-مرنگ روڈ لاہور

E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

Ph: 042-7249218, 7217430

تاریخ کی روشنی

ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس

18-مزیگ روڈ لاہور



فون: 7249218-7237430

E-mail: FictionHouse2004@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب :	تاریخ کی روشنی
مصنف :	ڈاکٹر مبارک علی
پبلشر :	گلشن پبلس
	18-مرگہ روڈ لاہور
فون :	7249218-7237430
ایہتمام :	خلید رحیم خاں
کمپوزنگ :	گلشن کمپوزنگ اینڈ ٹرانزیشن لاہور
پرینٹرز :	عالمی طبع پرینٹرز لاہور
سرورق :	عباس
پہلا ایڈیشن :	1990ء
دوسرا ایڈیشن :	1993ء
تیسرا ایڈیشن :	2005ء
قیمت :	120/- روپے

فہرست

7	دیناچہ
9	1- تاریخ کا استعمال
11	2- بنیادی تاریخ
13	3- اسلامی تاریخ
17	4- دہائی کی تشکیل کرے گا وہ مستقبل پر حکومت کرے گا
19	5- سیاسی تاریخ کا نگار
21	6- قبائلی تاریخ
23	7- بیرونی و درون
35	8- پاکستان میں تحقیق کے مسائل
38	9- جاگیردارانہ سیاست
42	10- تعلیم کچھ کے لئے
44	11- تعلیمی اداروں میں تشدد
49	12- آمریت کو کیسے روکا جائے؟
53	13- دی۔ آئی۔ پی اور مراعات
56	14- محل امراء کا خاتمہ اور ہمارے حکمران طبقے
58	15- مزائے موت
61	16- برمن اور احساسِ جرم
67	17- نازی اور تجربہ سے سیکھنا
70	18- قوم و قوم پرستی
74	19- ناکسٹرم
77	20- قراشیہ انقلاب
80	21- امریکی تاریخ کی تشکیل
84	22- عرب قوم پرستی
87	23- اسلام کے اندر جدوجہد
92	24- عربوں کے معاشرے میں رنگ و نسل

وہابچہ

اس وقت پاکستانی معاشرہ کی جو صورت حال ہے، اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم اپنے اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا تھا، وہ ہمیں پس ماندگی، جمالت اور اندھیرے کی جانب لے جا رہا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہم نے وقت کا ساتھ نہیں دیا، اور عالمی اقدار کو نہیں اپنایا، تو اس صورت میں ہم دنیا سے کٹ کر اور نیچے کی طرف گرتے چلے جائیں گے۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہ زمانہ جمہوری اور سیکولر اقدار کا ہے کہ جس میں معاشرے کے ہر فرد کو مساوی حقوق ملنے ہیں اور انہیں مذہب، نسل، یا زبان کی بنیاد پر ثانوی درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے، ایک مضبوط اور مستحکم معاشرہ جب ہی قائم ہوتا ہے کہ جب اس میں ہر فرد کو برابر کے حقوق ملیں۔

یہ حقوق سے محرومی ہے کہ جو اقلیتوں اور افراد کو تشدد اور بے فسی کی جانب لے جاتی ہے، اور جب خود ریاست تشدد کے اہتیاروں کو استعمال کر کے، اذیت، قید و بند، اغوا، رشوت، اور قتل کے ذریعہ اپنا تسلط قائم کرتا ہے تو پھر یہی ماحول سیاسی، سماجی بھی اختیار کر لیتی ہیں، اس لئے سب سے پہلے ریاست کو تشدد ترک کرنا چاہئے اور وحشت و خوف کے حوالہ کو ختم کرنا چاہئے، اس کے بعد ہی لوگوں میں اس پر اعتماد ہو گا۔

آرٹھ چونکہ انسان کا بحیثیت جمہوری مطالعہ ہے، اس لئے اس میں سمجھنے کو بہت کچھ ہے، لیکن سمجھنے کے لئے ذہن کو کھولنا پڑے گا، اور اپنے تعصبات کو دور کرنا ہو گا، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ جب ذاتی مفادات کی جگہ قومی مفادات کو اہمیت دی جائے۔

کتاب کے آخر میں لکھن کے دو مضامین مکی آبادی پر ہیں، اگرچہ انہوں نے یہ تجویز مکی آبادی کو مد نظر رکھ کر کیا ہے، مگر اس میں ہمارے پورے معاشرے کی اذیت اور اس کا عمل جھلکتا ہے، اور ان خرابیوں کی نشاندہی ہوتی ہے کہ جو ہمارے ہاں عام ہیں، اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

آخر میں ظہور احمد خان اور رانا عبدالرحمان کا مکتور ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں دلچسپی لی، ورنہ کتابیں چھاپنا اور طبع پھیلانا آج کل معیوب سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

اکتوبر ۱۹۹۳ء

لاہور

95

114

119

122

125

135

145

25- جن چند اور ہندوستان کی قومی آزادی

26- فرقہ واریت برطانوی عہد میں

27- مولانا ابوالکلام

28- گاندھی اور ہندوستان کی سیاست

29- شہر کی مکی آبادیاں

30- کراچی کی مکی آبادیاں اور سابق مساجد

31- مکی آبادیاں، منصوبہ بندی اور تنظیم۔

تاریخ کا استعمال

جب بھی کسی معاشرے میں انتشار ہوتا ہے اور وہ کھوے کھوے ہوتا شروع ہو جاتا ہے تو اس وقت اگر تاریخ کی مدد لی جائے تو وہ اس فساد کے عمل کو روک سکتی ہے اور معاشرہ کے مختلف گمراہوں اور جماعتوں کے درمیان اتفاق اور سلامتی برپا کرکے تلاش کر کے انہیں ایک جہتی کے مواقع فراہم کر سکتی ہے۔ قومیت کا نظریہ صرف ایشیا و افریقہ کے لئے آزاد ہونے والے ملکوں کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ یہ ان ملکوں کے لئے بھی ضروری ہے جو ترقی یافتہ ہیں۔ اور جن کی بنیادیں مضبوط ہیں۔

اکثر ہمسایہ ملکوں میں پھیلے لوگوں کی توجہ مسائل سے ہٹا کر فن میں وطن پرستی کی تبلیغ کرتے ہیں تاکہ وہ محرومیوں کو بھول جائیں اور اپنے حقوق کا مطالبہ نہیں کریں۔ بلکہ اپنی اذیتوں اور دکھوں کے ساتھ وہ فن کی مصلحتات کے تحفظ کے لئے جدوجہد کریں اور ان کے دفاع میں اپنی جائیں بھی قربان کر دیں۔

ستم غریبی یہ ہے کہ ہماری تاریخ میں ماضی کی ہر تکمیل کی جاتی ہے تو اس میں قاتعین، جرنیلوں اور لوٹ مار کرنے والوں کی تعزیریں ہوتی ہیں۔ اور دانشوروں، دانشوروں اور ادیبوں و شاعروں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ماضی کی یہ تکمیل اس لئے بہت اہم ہے کہ اس سے قوموں کے راستے متعین ہوتے ہیں کہ یا تو وہ وہمشت پسندی، مخالفت اور تشدد کا راستہ اختیار کریں، یا امن و امان اور محبت کا۔ تشدد و طاقت کا راستہ بچت، اُمریت اور مطلق استبدادیت کی جانب لے جاتا ہے جب کہ امن و امان اور مخالفت جمہوری روایات اور یک جہتی کی نشاۃ کو پروان چڑھاتے ہیں۔

ہمارے سامنے جرمنی کی مثال ہے کہ جس نے، سوارک اور چیمپرلیم کی روایت کو اختیار کیا اور لیپ کیلٹ اور حل کے نظریات کو نظر انداز کر دیا جس کا نتیجہ فازی ازم کی شکل میں نکلا کہ جس نے پلاٹر جرمنی کو چاہی کا راستہ دکھایا۔

تاریخ کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس وقت برطانیہ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک بھی اس کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ ان کے موجودہ مسائل کو حل کیا جاسکے اور وہ عالمی سطح پر جو جرائم کر رہے ہیں انہیں چھپایا جاسکے۔ برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے برطانوی مورخوں پر زور دیا کہ وہ ایسی تاریخ نہ لکھیں کہ جس سے برطانیہ کے کردار پر آج کے دنوں میں اسروگی و غم ہو کہ جس میں نا اسیدی

واپس ہو اس کے بجائے ایسی تاریخ لکھی جائے کہ جس میں جوصلہ ہو "اتحاد ہو" یہی بات امریکہ کے سیکریٹری آف ایگريکچر نے کہی تھی کہ تاریخ ہی وہ آخری چیز ہے جو قوموں میں قوم ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے۔

پاکستان میں تاریخ کو کس طرح سے استعمال کیا جائے کہ اس سے لوگوں میں قومی شناخت پیدا ہو؟ اگر دیکھا جائے تو صرف تاریخ تنہا یہ کام نہیں کر سکتی ہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرہ کا نظام بدلے اور لوگوں کی بنیادی ضرورتیں کہ جس میں رہائش، تعلیم اور صحت انتظامی اہم ہیں وہ پوری ہوں اس وقت تاریخ لوگوں میں قومی شعور کو بیدار کرنے میں سوز ہو گی۔ اگر یہ سماجی معیار رہے تو یہ ممکن نہیں کہ محفل لوگوں کے جذبات کو ابھار کر انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے دشمنوں اور غلاموں کو بھول جائیں اور اپنے استحصال کرنے والوں کے ہاتھوں کو منہ پھیر کر دیں۔

پاکستان کے لئے یہ سوال بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ ہم کون کیسے قوم کی تشکیل کے عمل کو شروع کریں؟ کیا لوگوں کے جذبات کو ابھار کر یا انسان دوستی کے نظریات پر؟ اگر ہمیں انسان دوستی کی راہیں اختیار کرنی ہیں تو اس صورت میں ہمیں تاریخ کے نقطہ نظر کو بدلنا ہو گا اور تاریخ میں قہین و بھولوں کی بجائے ایسے دانشوروں اور دیگر مفکرین کو تلاش کرنا ہو گا کہ جن کے پاس وہ شعور ہو جسے ہم اپنی قومیت کے لئے چاہتے ہیں۔

مثلاً پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کی تاریخ کو اگر سیاسی طور پر لکھا جائے تو اس میں نظریات، جنگ اور طاقت کے سوا کچھ نہیں اور یہ کھوجوں کے درمیان یہ دشمنی، آہستہ آہستہ دونوں طرف کے حوام میں مٹی جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کی ساری تاریخ تاریخی تاریخ پر زور دیا جائے تو ہمیں دونوں طرف کے حوام میں ہم آہنگی اور یکجہلی نظر آئے گی۔ سیاسی تاریخ میں جو سرحدیں ہیں۔ وہ سرحدیں طاقت توڑ دیتی ہے اور طاقت و دشمنی کے بجائے یہ ملے اور بات چیت پر زور دیتی ہے اس لئے سیاسی تعلقات کو دھندلے کرنے کے لئے ثقافتی تاریخ کی بڑی ضرورت ہے۔

سیاسی تاریخ کا دائرہ بڑا محدود ہوتا ہے اس میں ریاست اس کے دائرہ کے اندر ہے اور اس کی پالیسیاں آتی ہیں۔ جب کہ سماجی تاریخ میں معاشرہ اور لوگ شامل نظر آتے ہیں اور اس لئے یہ سیاسی تاریخ کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ اس وقت پاکستان کے معاشرہ کو سیاست سے لڑاؤ، طاقت کی ضرورت ہے۔

بنیادی تاریخ

مجھے مجھے دنیا میں تہذیبیں آ رہی ہیں ایسے ایسے زیادہ سے زیادہ لوگ اب سیاسی و سماجی طور سماجی امور میں حصہ لے رہے ہیں اور جمہوری روایات و اقدار منہ پھیر رہی ہیں۔ اس کی وجہ سے تاریخ کا دائرہ کار بھی بڑھ رہا ہے اور اب اس کے موضوعات صرف حکمرانوں اور امراء نہیں رہے بلکہ عام لوگ اور ان کی روزمرہ کی زندگی ہو گئے ہیں۔

اس صورت حال میں جرمی میں کچھ سوچوں نے کہ جن کا تعلق یونیورسٹیوں سے نہیں ہے۔ تاریخ کو ایک نئی شکل دی ہے اور ایسی تاریخ لکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے کہ جس کا تعلق لوگوں کی روزمرہ کی زندگی سے ہے اور اس کے لئے انہوں نے زبانی تاریخ کے طریقہ کو استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ مثلاً نظر کے نمائندگی کی تاریخ کو انہوں نے عام لوگوں کے نقطہ نظر سے لکھا ہے۔ کیونکہ جب تک ایسے بہت سے لوگ زندہ ہیں کہ جنہوں نے نظر اور ہاڈی دور کو دیکھا ہے اور اس میں انہوں نے کئی طریقوں سے حصہ بھی لیا ہے۔ اس لئے نئی تاریخ لکھنے والوں نے ان کے انٹرویو اور بات چیت کر کے۔ اور ان کی رائے معلوم کر کے تاریخ کے ایسے پہلوؤں سے پردہ اٹھایا ہے کہ جن کے بارے میں سرکاری یا پیشہ ور مورخ خاموش تھے۔

اس کے نتیجہ میں ایک ایسی تاریخ تشکیل ہوئی ہے کہ یہ سرکاری اور اکیڈمک تاریخ سے بالکل جدا ہے۔ کیونکہ سرکاری تاریخ کی بنیاد سرکاری دستاویزات، قرائین، خطوط اور آرکائیوز پر ہوتی ہے اور اس لئے ان ماخذوں کی بنیاد پر جو تاریخ لکھی جائے گی وہ بالکل طور پر اس میں سرکاری نقطہ نظر ظاہر حاصل کر لیتا ہے۔ اور اسی لئے واقعات کو حکومتی نقطہ نظر سے لکھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ تاریخ واقعات کو اوپر سے دیکھتی ہے۔ اور ان واقعات کی طرف میں جو عمل ہوتا ہے اسے نظر انداز کرتی ہے۔

جب کہ اس کے مقابلہ میں بنیادی تاریخ کہ جس کا تعلق معاشرہ کی چیزوں سے ہوتا ہے یہ واقعات کی تشریح چلی سٹا سے کرتی ہے۔ اس کے ذریعہ مورخ ایک عام آدمی کے تجربات کو بیان کرتا ہے کہ وہ ساتھ انداز میں بات کرتا ہے اور عام انداز میں واقعات کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ ان کے بیانات میں حقیقت ہوتی ہے یہ جو محسوس کرتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں اور انہیں اس کی کوئی حواہل نہیں ہوتی ہے کہ وہ مبالغہ آرائی کر کے خود کو تاریخ میں کیوں ثابت کریں۔ اس لئے ان کے بیانات کی روشنی میں تاریخ کے عمل کو صحیح طور پر

کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا اہم پہلو ان کے بیانات کا یہ ہوتا ہے کہ ان میں وسعت ہوئی ہے۔ اور یہ کسی خاص نقطہ نظر سے بات نہیں کرتے بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو اس میں سونپتے ہیں۔

اس تاریخ کی تشکیل کے بعد یہ ممکن ہو گیا ہے کہ فوری گزرتے ہوئے زمانہ اور اس تاریخ کو بہتر طریقہ سے سمجھا جا سکے۔ کیونکہ عام لوگوں کی مدد مو کی زندگی میں شہداء کی قیمتی رہائش کے مسائل، "نریک"، "برائے خدا"، "تخلیل"، "تقریب"، "حکومتی زندگی"، "تعلیم"، "صحت"، "درآمد"، "نیکوئی کا نظام"، "کتاب کی زندگی"، "کتابیں پڑھنے کی عادت"، "لوہر مساتوں کے ساتھ تعلقات" یہ اور دوسری بھون بھونتی چیزیں سب ہی آجاتی ہیں۔

پاکستان میں اس بات کی شے ضرورت ہے کہ اس قسم کی بنیادی تاریخ لکھی جائے تاکہ ہمارے معاشرہ میں جو تبدیلیاں آرہی ہیں۔ انہیں سمجھا جا سکے۔ صحیح معنی میں "ہم" اور "شیاء" کے دور میں عام لوگوں کی مدد مو کی زندگی انتہائی دلچسپ موضوع ہے تاکہ اس دور میں ہونے والے واقعات کے نتائج اور ان کے اثرات کا تجزیہ کیا جا سکے۔ یہ مسلم کیا جائے کہ اخلاقی قدروں کا زوال کیسے ہوا؟ کیا اس کی وجہ سے معاشرہ بدلتی ہوئی آگے بڑھا ہے یا مغرب میں نامہ ہوا ہے؟ یہ اور اس قسم کے سوالات ہیں کہ جن کا جواب لوگوں کے تجربات کی مدد سے ہی دیا جا سکتا ہے۔

اس لئے تاریخ "مستشرقین" اور "مسلیمین" اور ملتی جلتیوں کے لئے ایک انتہائی اہم اختیار ہے کہ جس کے ذریعہ وہ معاشرہ اور لوگوں کے رجحانات، "معاشرت"، "معاشرے" کو سمجھ سکتے ہیں اور معاشرہ میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور یہ کام بنیادی تاریخ پورا کر سکتی ہے کیونکہ اس تاریخ میں لوگوں کے بنی جذبات ہوتے ہیں ان کے دکھ ہوتے ہیں ان کی محنتیں ہوتی ہیں اور ان کے "جوہر" "مت"، "جرات" اور "محنت" بھی ہوتے ہیں کہ کس طرح ان عام لوگوں نے ایران اور حکومت اور ان کی قیمتوں کو برداشت کیا اور ان کے جبر اور خدا کے جبر اور خدا کو برا قرار رکھا۔ تمام میں زندہ رہنے کا حوصلہ پائی رہا بلکہ امرانہ کو خوشی ختم ہو گئی۔

اسلامی تاریخ

اسلامی تاریخ کی اصطلاح مغربی مستشرقین نے استعمال کیا شروع کی، اسی لئے انہوں نے تاریخ کو تقسیم کرتے ہوئے اس کو اپنے نظریات، خیالات، سوالات، نقطہ نظر سے مختلف اقدار دیکھ کر نام دیا۔ مثلاً ابتدائی دور میں انہوں نے اس کے لئے "عزیز کا لفظ استعمال کیا۔ اور اس سے "عزیز" تاریخ اور "عزیز" پچھلے کی اصطلاح شروع کی۔ بعد میں کچھ مسلمان یورپی تعلیم یافتہ لوگوں نے اس پر اعتراض کرنا شروع کیا اور یہ دلیل دی کہ مسلمانوں کو "عزیز" کہنا اس لئے صحیح نہیں کہ یہ لوگ عیسائیوں کی طرح پیغمبر کے ماننے والے نہیں ہیں بلکہ خدا اور اس کے فرشتے کے پیروکار ہیں لہذا ان کے لئے مسلمانوں کا لفظ استعمال کرنا چاہئے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ "عزیز" کی اصطلاح ترک کر کے اب مسلم یا اسلامی تاریخ کو استعمال کیا جاتا ہے۔

اس میں بھی مشکلات پیش آئیں۔ کیونکہ جب اسلام کی بنیادی تعلیمات اور عملی طور پر تاریخ میں تضادات سامنے آئے۔ تو کچھ مسلمان دانشوروں نے اس بات کی تشریح کی کہ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ میں فرق ہے۔ لہذا ان میں سے کچھ کے نزدیک اسلامی تاریخ غلامانہ راشدیوں کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اور کچھ صرف رسول اللہ کے دور کو اسلامی تاریخ تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد کی تاریخ اگرچہ مسلمانوں کی تاریخ ہے مگر اس کا اسلام سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں ہے۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ اسلامی یا مسلمانوں کی تاریخ جدید اصطلاح ہے کہ جسے مغربی مستشرقین نے متبادل بنایا ہے۔ ورنہ قدیم مسلمان مورخوں نے اس کو کبھی بھی استعمال نہیں کیا۔

اس کے بعد اسلامی یا مسلمانوں کی تاریخ کا دوسرا مرحلہ آیا ہے کہ اس سے اس طرح سے غلط اور اور میں تقسیم کیا جائے۔ مستشرقین کے نقطہ نظر سے اس کا پہلا دور اسلام کی آمد سے شروع ہو کر عباسی خلافت کے خاتمہ تک "ہ" ہے۔ اس کے بعد پھر خلافتی حکمران خاندانوں کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔ مصر اور شہنشاہی افواج کی تاریخ اور تاریخ مغرب کہا جاتا ہے۔ اس میں فاطمیں، مصر، الموحیدین اور دوسرے خاندان آتے ہیں۔ انہیں میں مسلمانوں کی حکومت کو "موروش دور حکومت" کہا جاتا ہے اس کے بعد عثمانی ترکوں، ایران کے مغربیوں، ہندوستان کے مغلوں کی تاریخ آجاتی ہے۔ اور اسلامی تاریخ کی اصطلاح اس

طرح سے اب صرف عربوں اور مشرق وسطیٰ کی تاریخ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

جب عرب ملکوں میں یورپی نوآبادیاتی نظام قائم ہوا تو سیاسی طور پر عربوں میں قوم پرستی کی تحریک شروع ہوئی تاکہ خود کو آزاد کرایا جائے اور قوم پرستی کی بنیاد پر خود کی شناخت کرائی جائے۔ اسی ضمن میں انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ تاریخ کو مذہب سے آزاد کر کے سیکور بنا دیا جائے اس کے نتیجے میں عیسائی اور دوسرے مذاہب کے عرب ایک قوم ہونے اور وہ مسلمان ہو عرب نہیں تھے وہ ہم مذہب بن سکے۔ چنانچہ عرب قوم پرستی نے اسلامی تاریخ کو مہلک ٹھکانا۔ اس میں خصوصیت سے عیسائی عربوں نے بڑا ہتھ کر رکھا۔ اس سلسلہ کی مشہور کتاب طلب حتیٰ کی تاریخ عرب ہے۔

عرب قوم پرستی کے زیر اثر جو تاریخی نگینے تھے۔ ان میں مختلف نکتہ ہائے نظر ملتے ہیں۔ مثلاً اکثر مورخوں نے اسلام سے پہلے کے دور کو جاہلیہ تسلیم نہیں کیا اور اس کی شان و شوکت کو ابھارا۔ بلکہ عرب ملکوں نے جن میں عراق قتل و کرب ہے۔ اس نے قدیم یسوعی مذہب کی تہذیب کو خوب اچاگر کیا اور اس کے ذریعہ عراق کی تہذیب کو ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ مصر میں ایک گروہ وہ ہے جو فرعونوں کی تاریخ پر فخر کرتا ہے۔ تو دوسرا وہ بھی ہے کہ جو اس ماضی کو جو اسلام سے پہلے تھا اسے برا سمجھتا ہے۔ اور عملی طور پر اسے رد کرتا ہے۔

لیکن اکثر مسلمان ملکوں میں تاریخ کو مذہب کے زیر اثر سمجھا گیا۔ اور ایسے مورخ قائم رہے ہیں جنہوں نے تاریخ کو سیکور نقطہ نظر سے لکھا ہو۔ اس نے اس تاریخ نگینے کی ایک اہم گنواہی یہ ہے کہ اس میں خود پر تنقیدی شعرت ہونے کے برابر ہے۔ اور اس کی وجہ سے تاریخ بعض تفریح کا ذریعہ رہ جاتی ہے۔ اس کے ذریعہ کسی قسم کا شعور پیدا نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً مصر کے مشہور ادیب دوسرے ذہن نے جب ایام جاہلیہ کے شعراء کی کتاب لکھی تو اس پر عرب دنیا میں زبردست احتجاج ہو گیا اور بالآخر مجبور ہو کر مستند نے دوسرے ایڈیشن میں اس کے کئی حصوں کو نکال دیا۔

اس خصلہ کے پیش نظر مورخوں کے لئے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ تاریخ پر تنقید کر سکیں اور حقیقت کا کوئی اعلیٰ سیار قائم کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب مسلمانوں کی تاریخ پر جتنا اعلیٰ اور پایہ کا کام ہو رہا ہے وہ مشرقی محققین کر رہے ہیں اور ہم ان کے تفکرات سے متاثر ہو رہے ہیں۔

اگرچہ چند محدود مسلمان مورخین نے کہ جنہوں نے یورپی تعلیم حاصل کی اور یورپ

کے تحقیقی طریقہ کار سے واقفیت حاصل کی۔ انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مشرقی تاریخ کے نقطہ نظر سے خود کو آزاد کرائیں۔ اور اس کی جگہ خود اپنا تاریخی نقطہ نظر دیں اور ان اعتراضات کا بھی جواب دیں کہ جو مغربی مورخین نے مسلمانوں کی تاریخ پر کئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے جو اپنے دماغ میں تاریخ کا نقطہ نظر اختیار کیا۔ اس میں کوشش کی گئی کہ اپنے ماضی کو شاندار بنا کر پیش کریں۔ اور اپنی برائیوں پر تنقید کرنے کے بجائے انہیں چھپا دیں یا ان کا دفاع کریں اور مغربی مستشرقین کو متعجب، تنگ نظر اور مسلمانوں کے دشمن کے طور پر پیش کریں کہ جو جان بوجھ کر تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں۔ تاکہ اس طرح سے ان کی بات کو تسلیم کر لیا جائے چنانچہ انہوں نے جو تاریخ کا نقطہ نظر اختیار کیا اس میں انہوں نے مسلمانوں کی مذہبی و تمدنی ورثہ کو اچاگر کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب یورپ کے مقابلے میں اعلیٰ و ادنیٰ تھی۔ چنانچہ جب اسلامی تہذیب و تمدن اپنے عروج پر تھے۔ اس وقت یورپ جہالت کے اندھیروں میں تھا اور مسلمانوں نے اعلیٰ یورپ کو تہذیب و تمدن کے ابتدائی اسباق پڑھائے اور انہیں اعلیٰ ثقافت سے روشناس کرایا۔

چنانچہ ان کی دیکل یہ تھی کہ اعلیٰ یورپ کی حضراتیائی دریا فنی صرف اسی صورت میں کامیاب ہوئیں کہ ان کی راہنمائی مسلمان جہاز راہنوں نے کی۔ کولمبس اور واسکو ڈے گاما دونوں کی کامیابی میں عرب جہاز راہنوں کا ہاتھ ہے ورنہ وہ خود سے یہ راستے دریافت نہیں کر سکتے تھے۔

اس طرح جب یورپ میں تعلیم متقدم تھی۔ اس وقت قبرص اور ایتھنز علم و ادب کے مرکز تھے اور ہمیں سے اعلیٰ یورپ نے علم حاصل کیا اور مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا۔ مسلمان حکمرانوں اور محاشروں کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ اقلیتوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لئے مددکاری کے جذبات رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے دور میں یہودی اور عیسائی آزادی کے ساتھ رہے اور انہیں ہر قسم کے حقوق حاصل رہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بہت سے مسلمان حکمرانوں کے مشیر اور معاصب یہودی تھے۔ اس لئے یہودیوں کے خلاف نفرت یورپ کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں کی نہیں۔

کیونکہ ہم سے مسلمان ممالک یورپ کی نوآبادی کے طور پر ان کے غلام رہے۔ اس لئے وہ اس کو اعلیٰ یورپ کی اس دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جو صلیبی جنگوں کی صورت میں پیدا ہوئی تھی۔ بالکل گامیہ صوبہ ہے جو انہیں بار بار مسلمانوں سے انتقام کے

طرح سے اب صرف عربوں اور مشرق وسطیٰ کی تاریخ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

جب عرب ملکوں میں یورپی نوآبادیاتی نظام قائم ہوا تو سیاسی طور پر عربوں میں قوم پرستی کی تحریک شروع ہوئی تاکہ خود کو آزاد کرایا جائے اور قوم پرستی کی بنیاد پر خود کی شناخت کرائی جائے۔ اسی ضمن میں انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ تاریخ کو مذہب سے آزاد کر کے سیکولر بنایا جائے۔ اس کے نتیجہ میں جہائی اور دوسرے مذاہب کے عرب ایک قوم بن گئے اور وہ مسلمان جو عرب نہیں تھے وہ ہم مذہب بن گئے۔ چنانچہ عرب قوم پرستی نے اسلامی تاریخ کو عملی بنایا۔ اس میں خصوصیت سے جہائی عربوں نے بڑا حصہ کر لیا۔ اس سلسلہ کی مشہور کتاب قلب حتیٰ کی تاریخ عرب ہے۔

عرب قوم پرستی کے زیر اثر جو تاریخیں لکھی گئیں۔ ان میں مختلف تہذیبی نظریے ہیں۔ مثلاً اکثر مورخین نے اسلام سے پہلے کے دور کو جاہلیہ تسلیم نہیں کیا اور اس کی شہنشاہی و شوکت کو ابھارا۔ کچھ عرب ملکوں نے جن میں عراق قابل ذکر ہے۔ اس نے قدیم میسوپوٹامیہ کی تہذیب کو خوب ابھار کر کیا اور اس کے ذریعہ عراق کی عظمت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ مصر میں ایک کردہ وہ ہے جو عربوں کی تاریخ پر فخر کرتا ہے۔ تو وہ مزاحیہ بھی ہے کہ جو اس ماضی کو جو اسلام سے پہلے تھا اسے برا بھلا کہتا ہے اور مکمل طور پر اسے رد کرتا ہے۔

لیکن اکثر مسلمان ملکوں میں تاریخ کو مذہب کے زیر اثر لکھا گیا۔ اور ایسے مورخ کام رہے ہیں جنہوں نے تاریخ کو سیکولر نقطہ نظر سے لکھا ہے۔ اس نے اس تاریخ نویسی کی ایک اہم کردہی ہے کہ اس میں خود پر تنقیدی عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور اس کی وجہ سے تاریخ مکمل طور پر کا ذریعہ نہ جاتی ہے۔ اس کے ذریعہ کسی قسم کا شعور پیدا نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً مصر کے مشہور ادیب و مؤرخ طہ حسین نے جب ایام جاہلیہ کے شعراء پر کتاب لکھی تو اس پر عرب دنیا میں زبردست احتجاج ہو گیا اور جلا کر بھجور ہو کر مصنف نے دوسرے ایڈیشن میں اس کے کالی حصوں کو نکال دیا۔

اس غلطی کے پیش نظر مورخوں کے لئے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ تاریخ پر تنقید کر سکیں اور تحقیق کا کوئی اعلیٰ معیار قائم کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب مسلمانوں کی تاریخ پر اتنا اعلیٰ اور پایہ کا کام ہو رہا ہے وہ سب سے زیادہ یقیناً کر رہے ہیں اور ہم ان کے نظریات سے متاثر ہو رہے ہیں۔

اگرچہ چند محدود مسلمان مورخین نے کہ جنہوں نے یورپی تعلیم حاصل کی اور یورپ

کے تحقیقی طریقہ کار سے واقفیت حاصل کی۔ انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مغربی تاریخ کے نقطہ نظر سے خود کو آزاد کرانیں۔ اور اس کی جگہ خود اپنا تاریخی نقطہ نظر دیں اور ان اعتراضات کا بھی جواب دیں کہ جو مغربی مورخین نے مسلمانوں کی تاریخ پر کئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے جو اپنے دفاع میں تاریخ کا نقطہ نظر اختیار کیا۔ اس میں کوشش کی گئی کہ اپنے ماضی کو شاندار بنا کر پیش کریں۔ اور اپنی برائیوں پر تنقید کرنے کے بجائے انہیں چھپا دیں یا ان کا دفاع کریں اور مغربی مستشرقین کو متعصب، تکفیر اور مسلمانوں کے دشمن کے طور پر پیش کریں کہ جو جان بوجھ کر تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں۔ تاکہ اس طرح سے ان کی بات کو تسلیم کر لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے جو تاریخ کا نقطہ نظر اختیار کیا اس میں انہوں نے مسلمانوں کی تہذیب و تمدنی ورثہ کو ابھار کر لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب یورپ کے مقابلے میں اعلیٰ و ارفع تھی۔ چنانچہ جب اسلامی تہذیب و تمدن اپنے عروج پر تھے۔ اس وقت یورپ بحالت کے اندھیروں میں تھا اور مسلمانوں نے اہل یورپ کو تہذیب و تمدن کے ابتدائی اسباق پڑھائے اور انہیں اعلیٰ ثقافت سے روشناس کرایا۔

چنانچہ ان کی دلیل یہ تھی کہ اہل یورپ کی جغرافیائی دریافتیں صرف اسی صورت میں کامیاب ہوئیں کہ ان کی راہنمائی مسلمان ہماز و ناوین نے کی۔ کولمبس اور واسکو ڈے گاما دونوں کی کامیابی میں عرب ہماز و ناوین کا ہاتھ ہے ورنہ وہ خود سے یہ راستے دریافت نہیں کر سکتے تھے۔

اس طرح جب یورپ میں تعلیم منقوہ تھی۔ اس وقت قبرص اور آرمین علم و ادب کے مرکز تھے اور یہیں سے اہل یورپ نے علم حاصل کیا اور مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا۔

مسلمان حکمرانوں اور معاشرہ کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ اقلیتوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لئے دوا داری کے جذبات رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے دور میں یہودی اور عیسائی آزادی کے ساتھ رہے اور انہیں ہر قسم کے حقوق حاصل رہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بہت سے مسلمان حکمرانوں کے شہر اور معاہدہ یہودی تھے۔ اس لئے یہودیوں کے خلاف نفرت یورپ کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں کی نہیں۔

کہ جب بہت سے مسلمان حکماک یورپ کی نوآبادی کے طور پر ان کے غلام رہے۔ اس لئے وہ اس کو اہل یورپ کی اس دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جو صلیبی جنگوں کی صورت میں پیدا ہوئی تھی۔ ناکالی کا یہ صدمہ ہے جو انہیں بار بار مسلمانوں سے انتقام کے

لئے اہم تھا ہے۔ اور مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کا قیام بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جیسا کہ صلیبی جنگوں کے دوران شام میں عیسائیوں نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں تھیں۔ اس لئے یہ یہودیوں اور عیسائیوں کی باہم گزاری ہے کہ انہوں نے ماضی کی رواداریوں کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ساتھ برا سلوک کیا۔

بعد میں کچھ ایسے مفرطے بنائے گئے کہ جنہوں نے مسلمان مورخین کی اس دلیل کو ذلت کا نیا کہ انہوں نے یورپ کی ترقی کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔ مثلاً انیسویں صدی میں 'اقتل کی شان و عظمت کے بارے میں دریافت ہوئی' ہوا یہ کہ ۱۸۳۰ء اور ۱۸۸۲ء کے درمیان سترھویں صدی کے ایک مورخ الماری کی کتاب انگلستان میں چھپی۔ اس میں مسلمان اسپین کے ساتھی وطم لوب کے بارے میں واقعات تھے۔ اس کتاب کی اشاعت اور مسلمانوں کے کارناموں نے مسلمان دنیا کے لئے فخر کا جب فراہم کیا۔ اور ترکی کے سلطان عبدالحمید دوم نے فوراً ترکی کے اسکالرز کو اسپین بھیجا کہ وہ وہاں سے مسلمانوں کے دور کے موصوفات دریافت کر کے لائیں۔ تاکہ اقبل کی عظمت جو مسلمان کے دور میں تھی۔ اس کو مزید ثابت کیا جائے۔ اس کے بعد سے مسلمان مورخوں کے لئے یہ ایک پستیدہ موضوع بن گیا ہے کہ مس کے رویہ سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اہل یورپ کو علم و ادب و رہا مس سے روشناس کیا اور مدبر علم و ادب۔ مسلمانوں سے سیکھے کہ اس کی کتابیں اس وقت یورپ کی پختہ و سنیہ۔ میں پڑھاں میں ہیں۔

اس ضمن میں کچھ نایہ فہم مسلمانوں و صوبی اس میں قسمت میں ہو جاتی تو اس وقت یورپ میں اسلام کی بھراں ہوئی۔ اس پر ست سے مسلمان مورخ نفوس کا اظہار کرتے ہوئے اس کی ساری دہ داری چند جریوں پر ڈال دیتے ہیں کہ جس کی خود عرضات پالیسی کی وجہ سے یہ منہی موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

اس قسم کی تاریخ دو خطہ نظروں میں کی پیداوار ہوتے ہیں اس لئے ان میں یہ سوال نہیں ہوتا ہے کہ وہ صحیح تاریخی شعور پیدا کریں۔ یہ محض ہڈائی خود پر فخر اور ہڈائی کو پیدا کرتے ہیں۔ مگر اس کی کوئی نفوس پیدا نہیں ہوتی ہے اور نہ اس غیہ پر حال کی تعمیر ہو سکتی ہے۔

جو ماضی تشکیل کرے گا، وہ مستقبل پر حکومت کرے گا

ماضی کی تشکیل کس طرح سے ہو سکتی ہے وہاں پر ہو اور کس لئے ہو؟ یہ وہ اہم سوال ہے کہ جس میں ماضی پرستے ہوئے کیٹا جاتے۔ یہ کہ ماضی کی تشکیل وہاں کو بنائے 'تبدیل کرنے' انہیں ایک خاص مقصد راستہ دکھانے میں مدد دیتی ہے۔ مثلاً ۱۲ء ماضی ابتداً ہی سے رجعت پسند مورخوں کے ہاتھوں تشکیل ہوا اور انہوں نے قرون روایات اور اداروں کی تحریف کی اور حکمران طبقوں کے مفادات کا تحفظ کیا۔ اس لئے اہل قرون اولیٰ ماضی کے دوسرے پہلوؤں سے ناواقف ہے، اور وہ بھٹ 'قریب' تنگ نظری کے سایہ میں پروان چڑھی ہے اور یہی چیزیں اس کے دہان میں ساگی ہیں۔

ماضی کا علم انتہائی اہم ہے کیونکہ اس کے اندر معاشرہ کی ساری اور ثقافتی چیزیں ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اگر ماضی کے بارے میں ۱۲ء ماضی مصلحت اور ہڈی ہوں گی تو ہم بچے حال کو نہیں سمجھ سکیں گے اور نہ مستقبل کی بہتر طور پر تعمیر کر سکیں گے۔ اس لئے یہ سوال بحیثیت اختیار کر جاتا ہے کہ ماضی کی تشریح کس طرح کی جائے کیا اس سے لوگوں کو جاہل دکھا جائے۔ یا اس کے ذریعہ ان میں شعور پیدا کیا جائے۔

اس لئے ایک پسو تو یہ ہے بادشاہوں اور امراء کی تحریف کی جائے اور اس کی ماضی و باداری کے واقعات بیان کیے جائیں۔ کیونکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو ذاتی طور پر اس پر تیار کیا۔ تاکہ وہ اقتدار کے حال لوگوں کی حریت کریں اور ان کے وفادار رہیں اس کے بعد خدا کے کردار کی تحریف کی جاتی ہے کہ کس طرح خدا حق سے سرشار ہو کر انہوں نے مسلمانوں کے سامنے بھی کھ حق کیا۔ ان کی اس تاریخی تصویر کے سامنے آنے کے بعد خدا کی دہائی معاشرہ میں مقلم ہو جاتی ہے۔ وہ لوگوں میں یہ تاثر عام ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ماضی میں بھی حق کا ساتھ دیا تھا اور اب بھی یہ حق کے لئے لڑیں گے۔ اس کے بعد صوفیوں کا نیر آتا ہے۔ اور اکثر تو حکمرانوں سے بھی برتر قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے تاکہ حوالہ کی تعلیمات لوگوں میں بشارت کے جذبات کو نہیں ابھرتے ہیں اور اسیں قناعت و مبرا کا درس دے کر مطمئن رکھیں۔

یہ ۱۲ء ماضی ہے کہ وہ ۱۲ء مورخوں نے تشکیل دیا ہے۔ اور اس کو اس قدر مقدس بنا دیا ہے کہ اس سے ذرا بھی انحراف کرنے پر برا سمجھا جاتا ہے

اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ماضی کی از سر نو تشکیل کی جائے اور عکسوں
ملاو اور مونیو کے کردار کو سامنے لایا جائے کہ جس سے سماج کو نئے فیس دیکھنے دیا اور
نکاح تک جاد رکھا۔

سیاسی تاریخ کا لکھنا

جیسی تاریخ کا سب سے بڑا البم ہے کہ اس کو عکسوں طبقے اپنے اقتدار اور طاقت کے
لئے استعمال کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ وہ ایک طرف تو اپنے ہارے میں خوش کن اور
ابھی تصویر پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے کانٹوں کے ہارے میں من گھڑت قیسے
کتابوں کے ذریعہ ان کے لئے لوگوں میں نفرت پیدا کرتے ہیں۔ اور جب بھی وہ گرافوں
میں گرفتار ہوں یا پریکٹسوں میں مبتلا ہوں تو اس وقت وہ ماضی کا سارا بے کر خود کو محفوظ
رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ماضی کی شان و شوکت کی ماضی تو گروں کے جذبات کو
محظوظ کرتی ہیں اور جب اولین و قوم پرستی کے نام پر نہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ
معاشرے کی باتیں لکھیں اور بداشت کریں اور ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائیں
کیونکہ ماضی کی شان و شوکت کو استعمال کر کے ایک طرف تو قوم پرستی کے جذبات کو
گرا کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اس کے ذریعہ عقیدوں کو بداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کیا
جاتا ہے مثلاً پرنگلی میں سالانہ کی آمدیت کے دوران میں اس کے خلاف تمام کانٹوں کو
اسی بنیاد پر دیا گیا کہ وہ پرنگلی کی ماضی کی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور ایسی
کوئی بھی مخالفت جو ماضی کو روایات اور عظمت کو ختم کرنے کی کوشش کرے وہ ملک اور
قوم کے خلاف ایک سازش ہے۔ یہی صورت حال برصغیر سے ایشیا و افریقہ کے نئے آزاد
ہونے والے ملکوں کی ہے جو ماضی کے ذریعہ اپنی مرشد اور چاہراندہ حکومتوں کو برقرار رکھے
ہوئے ہیں۔

ماضی قوموں کو اس وجہ سے دکھل لگتا ہے کیونکہ اس میں جو لحظات اور ہمدردی کے
واقعات ہوتے ہیں اس سے حساس عوامی کے ہارے لوگ یا جذبہ اور جوش محسوس کرتے
ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ ان کا یہ ماضی دوبارہ سے راہیں آجائے۔ چنانچہ یہی صورت
حال پاکستان میں ہے کہ ہمارے عکسوں مسائل کو حل کرنے کے بجائے لوگوں کا حوصلہ یہ
کہہ کر بڑھاتے ہیں کہ ان کے تباہ و برباد ہونے صدیوں بعد ہندوستان پر حکومت کی اور اس بات
میں بھرپور یہ حوصلہ جرات اور ہمدردی ہونا چاہئے کہ وہ ان قدر ہمدرد ہیں اور
ہوتا یہ ہے کہ لوگ ہندوستان میں آکر قوانین کو چیلنج کریں اور حقائق کو کھینچے کہ ہندوستان
جائے ہیں اور جب وہ اس صورت حال میں ہوں تو یہ سماں ہو جاتا ہے کہ اس میں
کے ذریعہ لفظ راستوں پر سے چلایا جائے اور ہمیں اپنے سامنے کے لئے استعمال کیا جائے

اس سے سیاسی تاریخ حکمرانوں کے ہاتھوں میں ایک خطرناک ہتھیار رہی ہے جو اس کے رویہ اپنے اندر کو مضبوط کرتے ہیں اور لوگوں کی ہمدردیوں حاصل کرتے ہیں اور سیاسی تاریخ کو محض اپنے کارناموں اور واقعات کے لئے استعمال کرتے ہیں چنانچہ اس قسم کی تاریخوں میں حکمران طبقوں کے افراد ایک شخصیت اور فرشتہ میرت ہوتے ہیں کہ جو ہمیشہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتے ہیں۔

پاکستان میں اس کا فائدہ عام سے فنی حکمرانوں نے پوری طرح سے اٹھایا اور لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ صرف حالات اور الزام ہی ان کی حفاظت کر سکتے ہیں اور ان کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں اس لئے فرج پاکستان کے اندرون و بیرون خطرات کا مقابلہ کرے کی اہمیت رکھتی ہے اس تاثر کی وجہ سے فرج شان و شوکت کی علامت بن گئی اور اس کے خلاف ہونا ملک و قوم کے خلاف غداروں کے حروف گھرا۔

سیاسی تاریخ کے اس فنی استعمال کی وجہ سے اس کی حیثیت بری طرح سے متاثر ہوئی اور مورخوں نے اس کو غلامانہ کرتے ہوئے ثقافتی و معاشی تاریخ کی طرف توجہ دینا شروع کی تاکہ تاریخ کو چند افراد کے لئے نہیں بلکہ معاشرے اور لوگوں کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ اسی وجہ سے سیاسی تاریخ لکھنے والوں میں یہ حساس پیدا ہوا کہ اس کو نئے سرے سے وسیع حدود پر استوار کیا جائے اور اس کی کمزوریوں کو دور کر کے اس کو اس قابل بنایا جائے کہ اس میں حکمرانوں اور افراد کے بجائے معاشرے کی تاریخ ہو اور یہ محض بادشاہوں اور جنگ و جدوجہد کا مرقع نہ بن کر سب سے بڑے معاشرے کے روبرو ہو معاشی و ثقافتی تبدیلیاں آتی ہیں جن میں بھی کھلا جائے۔ چنانچہ ان نظریات کے ذریعہ اب سیاسی تاریخ کی تشکیل ہو رہی ہے اور اس کو عربوں و عجموں سے سمجھنے کے لئے سوال کیا جا رہا ہے۔

قبائلی تاریخ

اس کی ایک مثال قبائلی تاریخ کا لکھنا ہے۔ اس تو مورخوں کے لئے جو مرید اور ہوجستان کے قباک کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے سب سے بڑی یہ مشکل ہے کہ چونکہ ان علاقوں میں ریاست اور اس کے ادارے بھی مضبوط نہیں رہے اس لئے ان کی کوئی تاریخ جو کہ سبوتا اور جائز ہو سکی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ چونکہ ان علاقوں کے قبائل ہمیشہ سے مرکزی حکومت کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔ اس لئے دربار کے مورخ ان قبائل کو باغی اور سرکش کہتے رہے ہیں اور ان علاقوں کو انتشار و بے چینی کا مرکز بتلاتے ہیں۔ تاریخ میں ان کے لئے جو حلی رویہ ہے اس کی وجہ سے ان قبائل کا کردار مثبت طور پر نہیں ابھرا اور ان کے لئے کوئی ہمدردی کے جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ سرکاری مورخ ان قبائل کی روایات، رسمیں، عادات اور طور طریقے سے بے خبر رہے یا ان پر زیادہ توجہ نہیں دی اور جنس ریاست کے سن و استحکام کے لئے ہمیشہ ایک خطرہ بنا۔

جب ہندوستان میں برطانوی اقتدار قائم ہو تو انہوں نے بھی اسی نقطہ نظر کو ورثہ میں دیا اور ان قبائل کو باغی و سرکش گردانا۔ کیونکہ ایک طرف تو برطانوی اندر کی ان قبائل کے ساتھ مسلسل جنگ رہی جس کی وجہ سے ان کا رویہ انقلابی بنا اور دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ کچھ لوگوں نے ان کی مادری و برت کی تعریف کی اور یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں نے یہ کوشش کی کہ ان قبائل کے بارے میں رویہ اپنانے سے پہلے یا کوئی پالیسی تشکیل دینے سے پہلے ان کی تاریخ، ثقافت، رسوم و رواج کا مطالعہ کیا جائے ان کی زبانوں کو سمجھا جائے اور اس کے بعد ان سے بات چیت کی جائے یا جنگ کی جائے یا اس سے معاہدے کئے جائیں۔

چنانچہ یورپ میں جدید مورخوں اور سیدت، انسانیت اور مہارایت نے ان قبائل کے بارے میں تحقیقات کا آغاز کیا وہ ان لوگوں میں جا کر رہے ان کی رہائشیں یکسے اور ان کے بارے میں تحریری و لفظی مواد جمع کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی بحثیں دہائیاں سے آئیں کہ جن سے دیا والے بے خبر تھے انہوں نے صرف ان زبانوں کو سمجھا ہی نہیں بلکہ انہیں کسی رسم الخد کے ذریعہ تحریر کرنا بھی شروع کیا۔ انہوں نے ان کی لوگ گائیاں اور کہیں کو جمع کیا ان کی تاریخ سے موضوعوں کو نکال کر خالق کو سامنے لائے چنانچہ ان معلومات کے نتیجہ میں ان قبائل کو جو سرکش و باغی سمجھو اور جاہل تھے ان کی ایک نئی

تصویر دنیا کے سامنے آئی۔ ان کی تاریخ اور ثقافت نے دنیا کے تفریحی ورثہ میں اضافہ کیا۔ چنانچہ ان دیوتاؤں کی وجہ سے تاریخ میں ان کو باعزت مقام ملا اور آپ ان کی تواریخ روایات و رسم و رواج کو حکمت کے بجائے عزت سے دیکھا جائے گا۔ مرکز سے ان کی مزاحمت کو گفتارِ بے نکتہ و سرکشی نہیں بلکہ آزادی کی جنگ کہ جائے گا۔ ان کی مبارکی جرات اور طاقت و فیاض کی سرینیں ہولے لگیں۔

اگرچہ ان تواریخ کے بارے میں اہم معلومات گزیراؤں و متلوہات و پورٹس، مخلوق، بادشاہوں، وائزوں اور سطراہوں کی شکل میں چھوڑ گئے ہیں اور اس لئے آپ مورخوں کے لئے یہ سولہ ہے کہ وہ ان تواریخ کی جامع تاریخ لکھ سکیں۔

لیکن محض یورپی تصنیف پر بھروسہ کرنا اور اسی کی بنیاد پر تاریخ لکھنا تاریخ کے تفصیلات کو متاثر کرتا ہے کیونکہ اس کے پس منظر میں نوآبادیاتی نظام حکومت اور اس کی پالیسی جس سے پاکستان کے مورخوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس سوا سے اس تضاد کی نشان دہی کریں کہ جو اس میں چھپا ہوا ہے اور ساتھ ہی میں ہی تحقیق کے ذریعہ تاریخ کو نئے سرے سے لکھیں کیونکہ اسی صورت میں ہم تاریخ کے ذریعہ لوگوں میں مثبت شعور پیدا کر سکیں گے۔

تیسرا ورثہ

مذہب کی تشکیل

ہمت کی ایسی مذہبی علامات جو تاریخ مقدس ہیں وہ اپنے ابتدائی دور میں نہ تو مقدس تھیں اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کی روحانی وابستگی تھی ان کا تقدس کہتہ آہستہ وقت کے ساتھ اور معاشرہ کی ضرورت کے ساتھ قائم ہوا یہاں تک کہ لوگ یہ سمجھ گئے کہ ابتداء میں یہ علامات کیا تھیں اور ان کا معاشرہ میں کیا مقام تھا۔

مثلاً صیہب کا نشان عیسائیت کی ابتداء میں کسی خاص مذہبی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ یہ ایک وہ ہے جس کی اس بڑائی نہ تھی جب سلفین عیسائیت کی تبلیغ کرتے تھے تو ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کسی ایسی علامت سے پرہیز کریں کہ جو ایویسی اور عامیہ کو پیدا کریں۔ مگر نئے عیسائیوں میں کسی قسم کا بھیدوں کا احساس نہ ہو۔ جب عیسائیت پوری طرح سے قائم ہو گئی اور اسے دیانت کی سرپرستی مل گئی۔ تو اس وقت صیہب بحیثیت ایک مذہبی علامت کے اہم ہو گئی اور دوسری صدی میں یہ چرچ کی تمام عمارتوں پر نظر آنے لگی بعد میں چرچ کے انبساط اور مذہبی مقام نے اس علامت کو لوگوں میں عقیدے کا مقام اور قربانی کے جذبہ کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ تاریخ کا یہ غیر اہم نشان آج عیسائیت کی اہم مذہبی علامت ہے۔

اس طرح سے کٹاری مریم کا تصور گیارہویں صدی کی پہلواں ہے۔ یہ اس ابتدائی زمانہ میں پیدا نہیں ہوا جب لوگوں کی زندگی سیدھی سادھی تھی معاشرے اس میں کٹاری مریم ان کے لئے ہمت کشش نہیں ہو سکتی تھی۔ بعد میں عیسائی معاشرہ میں مادی تہذیبیں آئیں اور اس میں عورت کا مادی مرتبہ پسے کے مقابلہ میں بلند ہو گیا۔ آرٹ کے ایک موضوع کینتو کا رنگ نے اس موضوع پر لکھتے ہوئے کہا کہ شاید یہ تصور اس وقت زیادہ ابھرا جب کہ صیہب جنگوں سے چھائی جلدین واپس آئے اور اپنے ساتھ عورتوں کی عکسوں اور خوبوں کا ایک تصور لائے کہ جس میں عورت مران اور دھول کی علامت تھی۔ آپ یہ علامت عیسائیت کی ایک اہم نشانی ہے کہ جو پوری دنیا کے عیسائیوں میں نازک جذبہ و محبت کو پیدا کرتی ہے۔

یہ علامات کسی طرح سے اہم بن جاتی ہیں اور کس طرح سے مذہب تشکیل پاتی ہیں اس کی ایک مثال موجودہ سماں میں مشہور صوفی خواجہ مسیح احمدی کی ہے۔ جب یہ ہندوستان

آئے اور اصول نے اجیر میں رہائش اختیار کی تو انہوں نے ایک چھوٹی سے جماعت کو متاثر کیا جو ان کی عہدہ ہو گئی۔ جب ان کی وفات ہوئی تو یہ ہمدردی میں مشغول رہے اور اسی لئے ان کی قبر کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پورے عہد صلاحیت میں حواجہ کھام رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر نے ایک مرتبہ دربار میں ستر چھ لوگوں کو گائے ہوئے سارے ان کے گلے سے چڑھا کر ہوا۔ اور اس نے ان درویشوں سے ان کے بچے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ یہ ثابت کہہ کر جو جاتی کا بعد۔ اور اس میں جنس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ روحانیت اور حق کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ لہذا اس نے حواجہ کے مقبرے کی زیارت کا فیصلہ کیا۔

اکبر نے مزار پر جا کر نہ صرف یہ کہ فاتحہ پڑھی بلکہ یہ حکم دیا کہ ان کی قبر پر معبود خیر آباد چاہئے اور دوسری عمارتیں بھی بنائی جائیں تاکہ رہائش و سہولت ہو۔ اس رہا۔ میں وہ حواجہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ ہر سال ان کے مقبرے کی زیارت کو جانے لگا اور کچھ سفر تو اس نے پیادہ ہی کیا۔

شاہی سرپرستی نے بہت جلد حواجہ کو مشہور کر دیا اور اس کی وجہ سے جلد ہی ان کے مریدوں کی ہمدردی بڑھ گئی۔ بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر امراء اور دیباچوں نے مزار کے سب سے قیمتی حصے کو تک و تحاشہ کر دیا۔ اس نے حواجہ کے مزار کی ہیبت کو اور بڑھا دیا اور پورے سو سال سے رہائش اجیر میں ضرورت کی غرض سے آئے گئے۔ اکبر کے بعد اس کے ہاشموں نے مزار اور اس کے مدگرد اور عمارتیں خیر کر تیں اور ان کے اخراجات کے سبب زمینیں وقف کر دیں۔ اور جب حواجہ مثل شاہی خاندان کے سرپرست بن گئے تو ان کا مزار مزید عام و عوام بن گیا۔

اب ان کی زندگی کارناموں اور معجزوں پر لاتعداد کتابیں ہیں اور وہ محبت سے حواجہ صاحب کلمات ہیں اور ان کے مزار پر فتنے اچھے کے لئے نہ صرف مسلمان بلکہ دوسرے مذہب کے لوگ بھی حق و برحق آتے ہیں اس کا سالانہ عرس بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ شاہی درجہ سے اجیر شہر کو بھی عزت مل گئی ہے اور اب مجیر شریف کہلاتا ہے۔

مذہب اس طرح سے بن جاتی ہے اور ایک مرتبہ جب لوگوں کے ذہن میں اس کی جڑیں بٹھ جاتی ہیں تو یہ حقیقت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ انہیں دوا سے ان کی اصلی شکل اور حالت پر لایا جائے۔ حقیقت کو صرف عقل کی بنیاد پر فکرت ہی

یا حقیقت ہے۔ مگر انہوں نے یہ ہے کہ ہمارے مورخ کم ہی عقل کی راہنمائی پر ایمان رکھتے ہیں۔

فرقہ وارت اور ہیرو

کئی ہیں ماندہ معاشروں میں شخصیتوں کی پرستش کی جاتی ہے کیونکہ ایسے ہی احوال میں معاد پرست جہتیں اور لوگ اپنے ملاقات کے تحفظ کی خاطر شخصیتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ اور انہیں ہیرو کا درجہ دے کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ جب کہ یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے وہ لوگ جنہیں بعد میں عظیم بنا دیا گیا یہ اپنے عہد و دولت میں کبھی بھی اس قدر ہم نہیں تھے۔ اور ان کے ہم عصر انہیں بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ بعد میں دوسرے کئی گنتائی سے لال کر لائے اور انہیں عظمت کا مقام دیا۔ لیکن شخصیتوں کو عظیم بنانے کا کام وقت کے تقاضوں کے تحت ہوتا ہے۔ جب تک یہ کچھ لوگوں کے مفادات کو پورا کرتی ہیں ان کی عظمت باقی رہتی ہے۔ اور جیسے ہی ان کی ضرورت ختم ہوتی ہے انہیں بھر سے فراموش کر دیا جاتا ہے۔

لیکن کچھ معاشرے اس قدر ہیں ماندہ ہوتے ہیں کہ ان کے ہاں تبدیلی نہ ہونے کی وجہ سے کچھ ہیروز پیشہ برقرار رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے ہیروز نہیں آتے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے معاشروں میں طبقاتی نظام ایک حالت میں برقرار ہے اس لئے یہ ہیروز ان کے مفادات کا تحفظ کرتے رہتے ہیں اور ان کو بدلنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

جب ہندوستان میں گریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی کی ابتداء ہوئی تو قومی تحریک کو ایسی شخصیتوں کی ضرورت تھی کہ جنہوں نے گریزوں سے مزاحمت کی ہو۔ تاکہ ان کے کارناموں کے ذریعہ ہندوستان کے ہر مدول ان پڑھ اور جاہل عوام کو متاثر کیا جاسکے اور انہیں قومی تحریک میں جذبہ اور جوش کے ساتھ شامل کیا جاسکے اور انہیں غیر ملکی حکومت کے خلاف لڑنا پڑے۔ اس وقت تک چونکہ ہیروز کی کمی تھی اس لئے ان کو امداد نے میں کسی طرحی قصبہ کا مثل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ سے قوم پرستوں کو بہت سے ہیروز ملے۔ چونکہ ان میں بہت سے مسلمان و دھرم تھے اس لئے قوم پرستوں کی تحریک کو ان سے مانگنا پانچا اور انہوں نے ان کی شخصیتوں کو خوب بڑھا کر پورے ہندوستانی انداز میں پیش کیا۔

ہیروز کی دوسری کڑی وہ تھی کہ جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ جذبات مگرمے ہو گئے اور دونوں جماعتوں نے اپنے اپنے ہیروز کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اس میں جن شخصیتوں کو سامنے لایا گیا وہ ایسے لوگ تھے کہ جو اپنے مخالفوں کے ساتھ لڑے تھے مثلاً وہ بھو جسوں نے مسلمانوں کو شکست دی اور وہ مسلمان جسوں نے ہندوؤں کو ہلایا اور کچلا اس مقصد کے لئے دونوں طرف سے تاریخ کو استعمال کیا گیا اور ایسے ہیروز کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لایا گیا۔ اور ان کی بھارتی، جڑت اور ہمت کے قصوں کو بڑھا چڑھا کر جان کیا گیا۔

اس وجہ سے ایسی شخصیتیں جیسیں تاریخ اور رہبر نے فراموش کر دیا تھا۔ وہ دہرہ زور، نکس، مثلاً شیواجی کی سادھی جس کے بارے میں لوگوں کو پتہ بھی نہیں تھا کہ کہاں ہے؟ سے تحریر جیسے ڈکٹس نے اپنی گائڈ میں اس نے بھی کے سلسلہ میں نکس تھی دریافت کیا اور یہ بتایا کہ شیواجی کی سادھی ویران پڑی ہوئی ہے اور اس کی کچھ بھال کرنے لاکوئی نہیں ہے۔ اس دریافت سے شک نے فوراً قائد المذاہد اور اس نے فوراً شیواجی کو ایک عظیم شخصیت قرار دے دیا اور اس کے کہنے کے مطابق شیواجی کی عظمت کے ذریعہ مہاراشٹر میں مزید حاصل کرے گا اور سرحدوں کو اس پر فتح ہو گا۔

بعد میں چند ہاتھ سرکار نے شیواجی کی گرسنت اور لورنگ نسب پر کتابیں لکھ کر ان دو شخصیتوں کو بطور رقیب بنا دیا دشمن پیش کیا اور ان دونوں کے درمیان تضاد کو ابھارا۔ اور یہی کچھ عمری کا نام محمود عمرانی اور محمد خوری کے ساتھ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے اپنے اپنے ہیروز پر فتح کرنا شروع کر دیا اور ان کے نفس قدم پر چلتے ہوئے ایک دوسرے سے نفرت کرنا اور خون بہانا اپنا دستور بنا لیا۔ اس طرح سے فرقہ واریت کی جنگ صرف حال ہی میں نہیں لڑی گئی بلکہ یہ ماضی میں بھی لڑی گئی۔ اور یہ جنگ ان دونوں میں اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ یہ اپنے اپنے ہیروز کو ہائی رکھیں گے اور اس کی عزت کرتے رہیں گے اور انہیں بدد کے لئے بدلتے رہیں گے کہ وہ دودھ سے تمبین اور دشمنوں سے انتقام لیں۔ ان ہیروز کے اس کردار کی وجہ سے معاشرہ میں امن و امان اور یک جہت کے جذبات کے بجائے تشدد و خون ریزی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ اور یہ معاشرہ کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

انقلاب اور ہیروز

ہر انقلاب ہیروز کو جنم دیتا ہے جو کہ حوام میں نہ صرف مقبول ہوتے ہیں بلکہ ان کی

عزت و احترام کیا جاتا ہے اور ایک حد تک ان کی پرستش کی جاتی ہے اور یہاں تک ان کا درجہ بڑھ جاتا ہے کہ ان کی ذات پر کسی قسم کی تنقید کی بھی اجازت نہیں ہوتی اور یوں ان کے گرد تقدس کا اہلہ ڈھرا جاتا ہے۔

فرائضی انقلاب اس لحاظ سے بالکل مختلف ہے کہ اس نے اس قسم کے ہیروز پیدا نہیں کیے سب سے پہلے تو یہ انقلاب ایک دم نہیں آیا۔ بلکہ کئی مرحلوں میں جا کر اس کی تکمیل ہوئی۔ اور ہر مرحلہ اور اسٹیج پر کئی جماعتیں جو نظریاتی طور پر ایک دوسرے کی مخالف تھیں وہ باہم لڑیں انہوں نے ایک دوسرے کی کمزوریوں پر مبنی سے تنقید کی اور ان کی سیاسی غلطیوں کی نشاندہی کی چونکہ انقلاب نے ریاست کے تمام اقتصادی اداروں کو ختم یا کمزور کر دیا تھا اس لئے گھبراہٹ رائے اور اشتباہ کی آزادی ہر شخص کو تھی۔

انقلاب کے دوران سیاسی صورت حال اس قدر مختار کا نظارہ تھی کہ کوئی ایک جماعت مکمل طور پر اقتدار پر اپنا قبضہ زیادہ دیر تک نہیں قائم رکھ سکی اس نے فزاد انتقاف جماعتوں میں برابر دخل ہوتا رہا۔ اور کسی کو یہ موقع نہیں ملا کہ وہ اپنے نظریات کو سارا پر خوب سے۔ یہ وہ دہرہات تھیں کہ جس کی وجہ سے فرائضی انقلاب میں انقلاب کے جتنی لاکوئی تصور پیدا نہیں ہوا اس انقلاب کے تمام بدلے ہوئے ہیروز جن میں ہیروائے حرث و حسد اور رہیں جبر شامل تھے وہ اپنی عظمت قائم نہیں کر سکے۔ جیسے ہی ان کے ہاتھ سے اقتدار گیا ایسے ہی وہ زبردست تنقید کی زد میں آ گئے۔ اور ان میں سے بہت سے تو انقلابیوں کے ہاتھوں مارے گئے اور ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے انقلاب کے ساتھ غداری کی۔ چنانچہ اس کی وجہ سے فرائضی انقلاب کے تمام رہنما تمام لوگوں کی طرح رہے اور مارتوں نے ان کی غلطیوں اور کمزوریوں کا تجزیہ کیا۔

اس کے برعکس امریکی اور روسی انقلابات کا رویہ مختلف رہا سب سے پہلے تو امریکہ کی جنگ آزادی کو امریکی انقلاب کا نام دیا گیا جب کہ حقیقت میں یہ کوئی انقلاب نہیں تھا کیونکہ اس نے معاشرہ کے بنیادی ڈھانچہ کو نہیں بدلا اس لئے یہ جو کہادرات کے خلاف جنگ آزادی تھی لہذا پہلے تو انہوں نے اسے انقلاب کہا اور اس کے بعد اس کے ہاتھوں کی ایک لبرلست تیار کی جو کہ جلد امریکی تاریخ میں ہیروز بن گئے چونکہ امریکی تاریخ بہت ہی مختصر ہے اور اسے شخصیتوں کی صورت ہے اس سے ان ہیروز نے اس صورت کو پورا کیا اور بہت جلد یہ امریکی قوم کے لئے باعث فخر بن گئے۔

لیکن نے بھی روسی انقلاب کی کلیدیائی کے بعد یہ منصوبہ بنایا تھا کہ وہ انقلابی ہیروز کے

مجھے تیار کرانے کا ان ہیروز کو اس نے یورپ کے مختلف ممالک سے ان کے انتظامی کردار اور سیاسی کارناموں کی وجہ سے چنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح سے لوگوں کی سیاسی تربیت ہو سکے گی۔ اس میں جو ہیروز شامل تھے وہ مارکس "انٹرنیشنل" ہیزن "گیری بلڈی" رائیس اور مائسن اور کچھ قریبی پسند شدہ شامل تھے۔ کیونست حکومت نے خود لیسن کو ایک دیوتا کا درجہ دیا اور اس کے جسم کو ایک شیشے کے تابوت میں محفوظ کر کے لوگوں کی زیارت کے لئے رکھ دیا۔ اس کے بعد انقلاب نے وہ ہیروز بنائے اور لوگوں کو پیچھے کی جانب دھکیل دیا۔

لیسن نے بھی انقلاب کے بعد بہت سے ہیروز بنائے لیکن ۱۹۳۱ء کی دہائی میں انقلابی انقلاب کے دوران بہت سے ہیروز کو ختم کر دیا گیا اور بعد میں تو وہ کارڈ بھی کھتا دیا گیا اور اب جو سیاسی تبدیلیاں آئی ہیں اس نے بہت سی شخصیتوں کو گتائی کے اندھیرے میں چھپا دیا ہے۔

دوس اور مشرقی یورپ میں جو سیاسی تبدیلیاں آئی ہیں اس میں پہلے ہیروز پہ بھی آفت آئی اور لوگوں کے خدشہ کا شکار بن گئے ہوئے جو کہ تو گرا دیے گئے یا انہیں سب کر دیا گیا۔ اور اکثر جیسے جیسے میں رکھ دیئے گئے۔ اس نے ایک بار بھر ثابت کر دیا کہ لوگوں پر جبر و تشدد کے درجہ کی شخصیت کو مسلمان کیا جاتا ہے۔

اس سے ایک سبق تو یہ ملتا ہے کہ انقلاب ہیروز کو بناتا ہے مگر انقلابی خلیں ان ہیروز کو ان کے مقام سے گرا کر قدسوں میں لا ذاتی ہیں۔ اس کے لئے لوگوں میں شعور کی ضرورت ہوتی ہے اور جرات کی، مگر وہ معاشرے کہ جو ہیروز پر اعتماد کرتے ہیں اور اپنی تقدیر ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں لوگوں کا اپنا کردار اور ان کی اپنی ذاتی ختم ہو جاتی ہے۔

جسوسیہت اور ہیروز

تاریخ میں اب تک عظیم بننے کے لئے ضروری تھا کہ افراد جنگ کے راستہ کو اختیار کریں اور لڑتے ہوئے طبیعت کے درجہ اپنی پہلائی و عظمت کو لوگوں کے دلوں میں قائم کریں۔ جنگ جو اور فاتح کی عظمت جس قیمت پر حاصل کی جاتی ہے۔ یہی لوگوں کا خزن ہوا کہ اور ان کے گھریلو کو اجاگر کرے اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اور جنگ کے نظریے کے مطابق وہ افراد جو تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں انہیں اخلاقی اقدار کی بدولت نہیں کوئی چاہئے۔

معتقد کا حصول ضروری اور اہم چیز ہے۔ وہ اخلاقی اور اس کی تدوین سے بالاتر ہے۔ اور چونکہ عظیم کوئی دنیا میں عام معتقد پورا کرنے سے نہیں۔ لہذا اس کی شخصیت عید سے مبرا ہوتی ہے اور لوگوں کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی پیروی کریں اور وہ جس اہم معتقد کو پورا کرنا چاہتے ہیں اس کی تکمیل میں ان کی مدد کریں۔

تاسکس میں نے قزو کی عظمت کے ان خیالات کو ذہن میں رکھے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان خیالات نے جرمن سماج میں غیر جمہوری روایات کو فروغ دیا اور فرد اور عوام کے درمیان دیوہست کا صلہ قائم ہو گیا۔ ہر اسی معاشرہ میں کہ جہاں فرد کی عظمت کا تصور ہو گا۔ وہاں ایک طرف تو غلامانہ ذہنیت پیدا ہوگی اور دوسری طرف "عراقی ذہن" منظم ہو گا۔

اگر دیکھا جائے تو فرد کی ذاتی عیش لوگوں کی قربانوں پر رکھی جاتی ہے اور اس عمل میں وہ عام انسان کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جس کا بے دردی سے اتصال کیا جاتا ہے۔ سلم غرق یہ ہوتی ہے کہ عظیم فرد بھی ان کی قربانوں پر نہ تو رنجیدہ ہوتا ہے اور نہ پشیمان بلکہ وہ انہیں استعمال کرتا ہے اور اسے حائل سمجھتا ہے کہ اس نے اچھے نیک اور عمدہ مقاصد کے لئے لوگوں کی قربان دی۔

جب لوگوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے تو ضروری ہوتا ہے کہ انہیں وفادار "اعانت گزار" اور وفادار بنالیا جائے۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کا عقیدہ عظیم فرد کی ذات میں مستحکم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں انسانی نیکیوں پر ان کا ایمان کمزور ہو جاتا ہے۔ لوگوں سے مسلسل یہ مانا جاتا ہے کہ فرد کو عظیم بنانے کے لئے وہ قربان دیں "اپنی سوائس پیس" کہ فرد کو دشمن و شہوت دہن۔ خود دوست برداشت کریں مگر سچے عظیم فرد کو طاقت، قوت، میں نے عظیم و کا تصور غیر جمہوری اور عوام دشمن ہوتا ہے۔ اور یہ امریت و مطلق حنا یہ کہ مفہوم کرنا ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں ذرا نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ اس قابل میں رہتے کہ کسی بھی قسم کی مزاحمتی تحریک چلائیں اور اپنے حقوق کے سچے و جدوجہد کریں۔

جب لوگ ہیروز بن جاتے ہیں اور اپنی تقدیر اس کے حوالے کر دیتے ہیں تو اس میں خود سچے کسی آجاتی ہے اور وہ اپنے تمام مسائل کا حل ہیروز کی سچوئے طاقت سے چاہتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ انہیں تمام جبرانوں سے بچا دے گا۔ اور جب ایک عرصہ لوگ اپنی طاقت و ذاتی ہیروز کے سپرد کر دیتے ہیں تو پھر اپنی عظمت کے نام پر

انہیں دلیل کرتا ہے۔ ان کے ساتھ ضرورت سے پیش آتا ہے اور جب وہ استعمال کے قابل نہیں رہتے تو انہیں کوڑے کرکٹ کی طرح سے پھینک دیتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ کی ذہنی ساخت میں جمہور کی پرستش موجود ہے کیونکہ یہ ماضی سے انہیں درس دیتی ہے اور چونکہ ان کے معاشرہ کے سیاسی و سماجی اور معاشی حالات نہیں بدلتے ہیں اس لئے یہ ماضی کے نظریات زندگی و لوگام معجزہ ہیں۔ ہماری پوری تاریخ ہی افراد کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے۔ مثلاً پاکستان کی تاریخ کو صرف وہ جموں میں بیان کر دیا جاتا ہے کہ: اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا اور محمد علی جناح نے اس خواب کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اور کوئی بھی یہ سوال نہیں پرچھتا کہ لوگ کہاں تھے؟ ہم نے کس کے لئے پاکستان بنایا تھا؟ اقبال کے لئے 'جناح کے لئے' یا لوگوں کے لئے۔ اور یہ بھی گما جاتا ہے کہ پاکستان سلطنتِ خداوندی ہے۔ تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کی گئی اور نہ وجود میں آئی۔

تاریخ کے اس نقطہ نظر کی وجہ سے لوگ جموں پر چین کرتے ہیں اور اس امید میں رہتے ہیں کہ کوئی سچا کئے گا اور انہیں نہایت دلائے گا۔ چنانچہ ہمارا معاشرہ جب کسی بھی محروم میں گمراہ ہے اور مسائل سے بے چارہ ہوتا ہے تو ہم جانتے ہیں کہ کوئی آئے گا اور ہماری مصیبتوں کا بدلہ کرے۔ اسی لئے ہم یہ دعا کہیں سنتے رہتے ہیں کہ جس پر تاریخی صلاح الدین کی ضرورت ہے، محمد بن قاسم کی ضرورت ہے، ورنہ کوئی نہ ضرورت ہے جو کہ ہمارے بدلے میں ۱۲۰۰ شخصوں سے لڑیں۔ اس قسم کی ذہنی تسکینی ہمیں کو مسدود کرتی ہے اور آمرانہ نظام کے قیام میں مدد دیتی ہے۔

نقل قدم پر چلنا

ہمارے معاشرے میں یہ دستور ہے کہ ہم خود ان نقل کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنے کپڑے بدلوا اور عظیم افراد کے نقل قدم پر چلے اور اگر کوئی ان کے راستے سے ہٹے یا ان کی نصیحت پر تنقید کرے تو اسے بغاوت سمجھا جاتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ تبدیلی اور جدت سے کس قدر گھبراتا ہے اور اس کے لئے یہ نہیں ہوتا ہے کہ اس کی ہزاروں روایات حضرات اور ان کی جگہ سے ہمارے وجود میں نہیں آئے تھے۔ نئی نسل کو بزرگوں کے نقل قدم پر چل کر پڑانے نظام اور پر اسے طریقوں کو قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

معاشرہ کے نظام کو ایک جا پر قرار رکھنے کے لئے عظیم افراد اور ان کی نصیحتات و اقوال کام میں لائے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی شخصیتوں کے گرد تقدس کا آلہ ہوتا ہے اس لئے لوگوں کو اس بات پر توجہ کرنا مسلمان ہونا ہے کہ ان کی کوئی بھی بات کو صحیح سمجھیں اور ان کی نصیحتات سے سیکھیں۔ اس لئے نقل کریں کہ ماضی میں بھی انہیں اچھی تھیں اور حل و مستقبل میں بھی اچھی رہیں گی۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں اعلیٰ و ادنیٰ کی زبردستی نہیں ہے اور اعلیٰ ہمیشہ درست اور صحیح بات کہتے ہیں اس لئے بچوں کو والدین کی اطاعت اور عوام کو راہبر کی اطاعت ضروری ہے۔ اس انداز میں عقیدے کے قیام میں لوگ اپنی عقلی صلاحیتوں کو کھر بیٹھتے ہیں اور اس قابل نہیں رہتے کہ اپنے لئے نئی راہیں بنا لیں یا تلاش کریں۔

چنانچہ ہمارے معاشرہ میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ہم عظیم افراد کے نقل قدم پر چل کر ہی تلاح و بہبود حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض اوقات مشکل پیش آ جاتی ہے کہ دانش و بائیس و لد کی سیاسی بنیادیں ایک ہی قسم کی شخصیتوں کو ملے کر اس کے قیام یا نصیحتات کے ذریعہ اپنے نقطہ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ اور لوگوں پر زور دیتی ہیں کہ وہ ان پر عمل کریں۔ مثلاً پاکستان میں قیام اور محمد علی جناح کی شخصیتیں اس کی مثال ہیں۔ ایک طرف حکومت اور دانش باز کی جماعتیں ان کے قول و زور پر جاتی ہیں۔ دوسری طرف انہیں مسلسل آتے رہتے ہیں اس کے ذریعہ اس کی تبلیغ کرتی ہیں کہ پاکستان ایک نظریے کے لئے بنا تھا۔ خیال پر شریعت کا قیام کے مسعودوں میں سے ایک تھا۔ اس لئے پاکستانی معاشرہ کو ان خوبیوں کو پورا کرنا ہے اور ان کی نصیحتات پر عمل کرنا ہے۔

دوسری طرف دانش باز والے یہ کہتے ہیں کہ درحقیقت ۱۹۴۷ء میں جس کے لئے ہم ان کو دانش باز والے انخواہ کر کے لے گئے اور اقبال ایک طرف جتنا کہی بات کرتے ہیں، ملا کو یہ کہتے ہیں اور عقلیت کا پرچار کرتے ہیں، جب کہ جناح ایک سیکرٹری پاکستان کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

کون صحیح ہے اور کون غلط؟ اس بحث سے قطع نظر اہم بات یہ ہے کہ دونوں طرف سے آپ خلاصہ نقل کے لئے اور لوگوں کو آمادہ کرنے کے لئے شخصیتوں ان کے نظریات و ان کی نصیحتات پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور کوئی یہ کوشش نہیں کرتا کہ محض خیالات و نظریات کی بنیاد پر لوگوں کو راقب کرے اور ان کے ذہن کو بچائے۔ مثلاً اکثر یہ کہ جاتا ہے کہ پاکستان کو ایک سیکرٹری ریاست اس لئے ہونا چاہئے کہ جناح نے قانون ساز اسمبلی کی پہلی تقریر میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جب کہ دوسری طرف سے جناح کی

تفصیل سے لاتعداد حوالے دیتے جاتے ہیں کہ جن میں دو قوی نظریہ کی بات کی گئی ہے۔
 ستر فروری کی بات۔ یہ کہ ہماری سیاسی جماعتیں اور حکومت یہ سمجھتی ہیں کہ لوگ
 نو پلٹوں کی مانند خاصیت رکھتے ہیں جس میں اس لئے انہیں اور بنا کر حرکت کرنا ہے اور یہ
 ان کے مفاد میں ہے کہ وہ اپنے کاموں کے نقش قدم پر چلیں اگر چنانچہ انہیں حکم دیا
 کہ وہ سیکور ہو جائیں تو پوری قوم کو بغیر سوچے سمجھے اس حکم کی تعمیل کرنی چاہئے اگر وہ
 کہیں کہ لوگ فدا کی و راجح اختیار ہو جائیں تو یہی یہ لوگوں کا فرض ہے کہ اس پر عمل
 کریں۔

ہمارے دانشور بھی یہ نہیں سمجھتے کہ نظریہ کی ملکیت سیکور ریاست بذات خود اچھی یا
 بری ہے یا نہ کہ کرنی ہی منشاء کسی کے حکم دینے سے۔ تو سیکور ہو جا رہا ہے اور یہ ملتی
 اس کے سے اس کے ڈھانچہ کو بنیادی طور پر بدلنا ضروری ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں
 لوگوں کی طبیعت بدلتی ہے اور نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی اس کا تجربہ نہیں کر سکتا کہ
 ہمارے معاشرے کو صورت "سیکولرزم" یا پہلی ازم کی کیوں ضرورت ہے؟

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ نظریات کو افراد کے ذریعہ سمجھیں بلکہ ان کے
 عمل کو مد نظر رکھ کر لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے اور انہیں سمجھا جائے کہ کیوں
 جمہوریت اور سیکولر ازم ضروری ہیں۔ اس لئے کہ یہ معاشرہ کو ذہنی لحاظ سے شتاب دہش
 گئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ عظیم افراد کے بچوں سے چھڑائیں گئے۔

ہیرو شگنی

مصلحتی تشدد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبدیلی کا عنصر ہے جس کی وجہ سے
 تشدد بابت ہمارے اور قزاقا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا علم بھی مغرب میں عمر ہوا نہیں ہے
 بلکہ اس میں مسلسل نئے نقشہ نظر آتے رہے ہیں اور نئے نظریات اس کو مزید دلکش بناتے
 رہتے ہیں۔ تاریخی نظریات کی تبدیلی کے اس عمل میں ماضی کی تشکیل تو ہوتی رہتی ہے اور
 بہرہ ور کو ایک زمانہ میں جو عظمت حاصل تھی وہ کم ہو جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے اور اس کا
 ملحد ریاکار مرتد کر بالکل نیچے آ جاتا ہے۔ وہ یہ بنا دیکھتا ہے اور حسی فیض حاصل ہوتا ہے کہ
 جب ایک مقدس اور بزرگ فرد کو ایک عام آدمی میں تبدیلی کر دیا جائے اور اس کے
 اور گرد قافم کئے ہوئے تمام مہر و حق کو توڑ دیا جائے۔ اس سے لوگوں میں یہ آگہی پیدا
 ہوتی ہے کہ تاریخ میں جو کچھ حاصل کیا جا رہا ہے وہ کسی خاص اوقاف یا اوقاف الفطری چیزوں

کی وجہ نہیں بلکہ عام لوگ ہی معاشرہ کی مدد سے اور لوگوں کی مدد سے کاروائی سرانجام
 دیتے ہیں۔

امریکہ اور یورپ میں حال ہی میں ایسی بہت سی کتابیں چھپی ہیں کہ جنہوں نے ماضی
 کے بہت سے ہیرو کو عام انسانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان میں آگناش بولنگبرگ اور
 نپولین بوناپارٹ کی سوانح حیات قلم کار میں مانی ایک مہر و حق ہے اس کی مدد سے
 ان کے سوانح پر لکھی ہے۔ بولنگبرگ کو ستر ریاستوں کے بانیوں میں سے تھا اور اس نے
 سب سے پہلے یہ پہلو پیش کیا تھا کہ "اگر وہ ستر ریاستوں میں سے نہ ہوتا تو
 ان کے نام سے جو جماعت بناتی تھی اس نے کیتھولک عقیدہ کے لوگوں میں ایک
 بڑا بڑا فرقہ پڑا۔" اس نے کیسوک کی نظموں میں وہی لفظ بن گیا۔ اور تاریخ میں اس
 کو "مارکس" کے طور پر بنا دیا گیا۔ مارکس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کو جو
 دین ہے وہ اس کی ذاتی ضرورتوں کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس لئے ہوتی کہ
 معاشرہ اس کو ان کی ضرورت تھی۔ وہی لفظ نہیں تھا بلکہ ایک عام آدمی تھا کہ
 اس نے انسانی کنوینشن بنائی۔

اسی طرح سے کولمبس اپنی امریکی تاریخ کا سب سے بڑا مفاد شخص بن گیا ہے۔
 میں اس کی "امریکی دریافت" کی مدد سے تاریخی مثال جاری ہے۔ اس کی اس نام فدا
 یافتہ سب سے بڑا مفاد امریکہ دیکھ کر نہیں کر رہے ہیں کہ ہمیں جس راہی
 مورخین کے کولمبس نے دریافت کیا تھا۔ اب مورخ ان اصلاحات پر بحث کر رہے ہیں کہ جیسے
 "دراخت" اور "دراخت" اور "دراخت" کہ یہ ممالک دریافت نہیں ہوئے
 یہ بلکہ ہمیں یہ کیا اور پھر نو آبادیات میں تبدیلی کر دیا گیا۔ اس لئے اب کولمبس کی مہم
 ہوتی کو ان الفاظ اور اصلاحات میں بیان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جن سے امریکہ
 قدیم کے باشندے ناراض نہ ہوں۔ اس لئے اس کی سوانح کے لئے اب تحریری لفظ
 Celebrate کی بجائے پہلی استعمال کیا جا رہا ہے (یہ جہتی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کہ
 کسی واقعہ کی یاد منانا کہ جس موقع پر اپنی غلطیوں پر پشیمان ہوا جائے) اسی طرح قاتل شک
 (Fighting) کے بجائے انکائر (Encounter) کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

ایک مورخ کرک ہیلرک نے کولمبس پر نئی کتاب لکھی ہے اس نے اس پر
 درست تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ پندرہویں صدی تھا کہ جس سے امریکیوں کو غلام بنایا
 اور وہ بیلیون انسانوں کا خون کیا۔ وہ ایک لحاظ سے پاگل شخص تھا کہ جس نے شیور ایرکٹ

اور انکار کا قتل عام کیا لیکن تل وہ پہلا مورخ نہیں کہ جس نے کوہیں کے جرائم سے پردہ اٹھا۔ ڈاکٹر جانتس نے اٹھارہ سو تیس میں کوہیں پر لکھتے ہوئے ان کے جرائم کے بارے میں لکھا تھا کہ جب کسی کمزور قوم میں طاقت ور قوم کے لوگ آجائے ہیں تو وہ کسی قدر برایت اور دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہیں، ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا جاتا ہے، ان کے شہروں سے انہیں نکال دیا جاتا ہے، ان کو خوف زدہ کرنے کے لئے قلعے تعمیر کئے جاتے ہیں، اور اس قدر فوجی طاقت حاصل کر لی جاتی ہے کہ انہیں وہاں سے نکالنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ ان کے ملک میں مالک و حاکم بن جاتے ہیں، اور ان کی قسمتوں کا فیصلہ کرتے جیتے ہیں۔ بلوچستان کو عربین نے دعوت نہیں دی تھی بلکہ یہ لوگ بغیر ہلکے دہاں گئے تھے۔ اور ان لوگوں کے درمیان گئے تھے کہ جنہیں قتل یہ علم نہیں تھا کہ ان کے ملک کے مدین بھی وہ ملک ہیں اور دوسری ایسی قومیں ہیں کہ جو ان سے بالکل علیحدہ صہبت رکھتی ہیں۔ ان لوگوں کو نہ صرف ہونا کھڑا کیا بلکہ اس کے بعد جھوٹ بھی بولا گیا۔

زید بن عمرو کی یہ کہیں کہ جب مارشل یٹو قند میں آیا تو اس کے گرد عظیم ہمسیت کا آنا پانا بنایا گیا، اور اسے پرتین کا درجہ دیا گیا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد اور روس و مشرقی یورپ میں سیاسی تبدیلیوں کے بعد ایک نئی تصویر سامنے آئی۔ اس نے آنا کتاٹس چمپی میں ایک کامران ہے، "یٹو کی عورتیں" اور دوسری ہے "یٹو، ماریٹ و رڈ" اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک بد عنوان اور عیاش انسان تھا۔ جس نے کہ تازیوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ جب یوگوسلاویہ کے ایک لوہوان سے ان کتابوں کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ "میرے لوگوں کے لئے یہ شاید صدمہ کا باعث ہو، لیکن توہان لوگ اس کے بارے میں بالکل نہیں سوچتے، ان کے لئے وہ ماضی کی ایک یادگار ہے۔"

پاکستان میں تحقیق کے مسائل

سچی اور ماحولی علوم میں تحقیق کے درجہ لوگوں میں تنہید اور کھوج کا احساس پیدا ہوا ہے، اسی لئے کسی بھی معاشرہ کی ذہنی ترقی، نشوونما اور ترقی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں ایسی تحقیق کی سرپرستی کی جائے کہ جو مذہب، سیاست اور سماجی دباؤ سے آزاد ہو، خود پر غلط نظریہ و افکار کی چوری چوری آزادی ہو۔ ایک تحقیق کو اس کے موقع ہوں کہ وہ کسی خوف اور خطرے کے چٹائی بات کہنے کے "کیونکہ بحث و مباحثہ، تنقید اور انہیں کے چاروں خیالات کے درجہ حق و باطل میں وضاحت ہوگی، اور اس سے لوگوں میں اپنے خلاف بحث بننے اور تنقید کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگا، اور اس کے درجہ یہ موقع پیدا ہوں گے کہ معاشرے کے مسائل کا واضح اور کھلے طور پر تجزیہ کیا جاسکے، کیونکہ تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ ان مسائل پر کرے کہ جس کا تعلق معاشرہ کے مسائل اور مسائل سے ہو، کیونکہ وہ تحقیق جو ان مسائل سے الگ ہو کر کی جائے گی۔ وہ معاشرہ میں خوسوڑ رہے گی، اور اس کے کوئی نتائج نہیں نکلیں گے۔

پاکستان میں تحقیق اس لئے بھی حائل ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں کوئی سیاسی انتظام نہیں ہے اور آئے دن نئی نئی سیاسی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، کیونکہ جو بھی نئی حکومت آتی ہے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انہیں اور دانشوروں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ایسے موضوعات پر لکھیں کہ جو ان کی پالیسیوں کی حمایت کریں۔ اور ان کے اقتدار کو اس سے ملوایا جائے۔ کیونکہ ہمارے کئی محقق اور دانشور حکومت کے ارادوں میں کام کرتے ہیں اس لئے وہ اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی ملازمتوں کو چھلانے اور ترقی کی خاطر اپنے ضمیر کے خلاف لکھیں۔ اس صورت میں ان کا کردار محقق اور دانشور کا نہیں رہتا ہے بلکہ وہ چور و کرہٹ اور حکومت کے ترجمان بن جاتے ہیں۔

میں چونکہ جو یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا ہوں۔ اس لئے مجھے اندازہ ہے کہ یونیورسٹی اور حکومت کے اداروں میں کسی طرح سے تحقیق ہوتی ہے۔ خاص طور سے تاریخ میں جو کچھ ہوا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہ چا سکتا ہے کہ ہمارے مورخوں کو بہت کم یہ جرات ہوتی ہے کہ وہ حکومت کے غلط نظریے اختلاف کریں، اور جو سرکاری تاریخ کا دائرہ ہے اس سے انحراف کریں، دلچسپ بات یہ ہے کہ تاریخ میں نظریہ کا طالع ہمارے یونیورسٹیز کرتے ہیں اور اس پر نظر رکھتے ہیں کہ کوئی اسکالر جس کی خلاف ورزی نہ کرے۔

مثلاً ایک کانفرنس میں پاکستان سٹارٹنگ ایڈ جنرل کے انسٹی ٹیوٹ میں اس بات پر اعتراض کیا گیا کہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شاہ ولی اللہ پر تو ایک کتاب بھی ہے اس میں اس پر تنقید کی گئی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جنرل نے 'جو کہ خود ایک مورخ تھے' مذکور کرتے ہوئے کہا کہ کتاب میں کے 'سنے سے پسے ہوئے' ہیں۔ یہ کہ وہ اس کتاب کو واپس لے لیں گے اور اس کی سرکوشش نہیں ہونے دیں گے اس کے بعد اس سے یہ یقین دلایا کہ 'سنہ سے اپنے اندر دت کے جا رہے ہیں'۔ جس نے انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع نہ ہوں۔ انہوں نے اپنے وعدہ کو قائم رکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس انسٹی ٹیوٹ نے کسی قسم کی عمر تحقیق تاریخ اور ثقافت میں نہیں بنی۔

مجھے اس سلسلہ میں اپنا ایک واقعہ یاد ہے۔ سب میں نے محمد علی قاسم سے بارہے میں یہ بیان دیا کہ اس کا منہ پر حمد جارحیت تھی تو منہ پر نواز شریف کے کچھ ساتھ نے اس وقت کے وائس چانسلر سے یہ سنا۔ یہ کہ مجھے اس قسم کا یقین دینے کی وجہ سے پورے شریف سے لکل دیا جاتے۔ چنانچہ اکثر یہ کواہ سر پر لکھی رہی ہے خود اس طرف سے اکثر اسکالرز خاموش رہتے ہیں۔

اس لئے ظاہر ہے کہ جب تک قیاداروں نے ہوں اور اسکالرز ملے ہیں۔ فکر نہ ہوں اس وقت تک کسی قسم کی تحقیق ممکن نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اگرچہ کافی سہ اور امیر ہوگ موجود ہیں۔ مگر ان میں سے کسی کو اس اہمیت کا احساس نہیں کہ صورت اور سیکولر روایت کو تاریخ دینے کے لئے کچھ ادارے بنائے جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تاریخی اور سکولر روایت پر یقین نہیں رکھتے جب کہ مذہبی دعووں کو قائم کرے ہیں۔ یہ کہ یہ نہ کہ ہمارے ہیں۔

پاکستان کے یہ سب سبوں میں اب یہ کہ یہ سب سب کے ہوتے تو ہمارے پاکستان سے اور یہ بھی ہمارے تحقیق حکومت سے ہوتا ہے۔ یہ کہ یہ سب سب کے ہوتے تو ہمارے دور سارا دور قوی طور پر دیکھا ہے اس نے علاوہ تحریف کردہ روایت کے دوسرے تمام پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ تحقیق نہ تو تاریخ کی کئی تعبیر کرتی ہے نہ سچے پہنچ رہی ہے اور نہ ہی نئے تصورات و نظریات کو پیش کرتی ہے۔

ہمارے یہ سب سبوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر بار بار تحقیق ہوتی رہتی ہے اور اس کے لئے نہ تو نیا مواد استعمال کیا جاتا ہے نہ ہی نئے نقطہ نظر دیا جاتا ہے۔ مثلاً "تحریک آزادی میں منہ کا حصہ" پر چھ یا آٹھ تھیں کیسے جانچے ہیں اور یہ سب ایک

ی مواد اور ایک ہی نقطہ نظر کو پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی میں کوئی نئی بات یا نئی تحقیق نہیں ہوتی ہے۔ دوسرا موضوع منہ کی پہلی سے پہلے ہی ہے اس میں بھی ایک ہی مواد کو ماسے رکھ کر سے منہ ہی مساویوں کے نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے۔

اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ایک طرف تو گروہوں حاصل کر کے لئے منہ 'سرحد' اور پنجاب میں ان موضوعات پر تحقیق کرانی یا دی ہے کہ جو ان صوبوں کے اس پہلو کو اجاگر کرے کہ جس سے پاکستان کی تحریک منہ ہوئی جب کہ دوسری جانب ان صوبوں میں پاکستان اور اس کی مرکزیت کے خلاف جذبات بھی رہے ہیں اس لئے ان تحقیقات کا لوگوں کے ذہن پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ لوگ اس میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد کیا ہو؟ کیوں یہاں کا سیاسی نظام قائم ہو؟ قریح اور پیور وکرکس کی حالت دور ہوئی؟ چونکہ ان تحقیقات کا تعلق معاشرہ کے مسائل سے نہیں ہے اس لئے انہیں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اور ان میں سے اکثر شائع شدہ کتابیں اسکولوں میں پڑی گئی مڑتی رہتی ہیں۔

ایسی صورت حال اس وقت ہوتی ہے کہ جب ریسرچ اسکالرز کو ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے موضوعات دیے جاتے ہیں ان موضوعات کو دینے سے قبل پوری طرح سے جانچ لیں کی جاتی ہے کہ یہ حکومت اور اس نظریہ کے خلاف نہ ہوں۔

ان تمام دیکھوں کے باوجود ہماری حکومتیں مطمئن نہیں ہیں اور اس لئے برابر ایسے قوانین بنا رہی ہیں یا آڈیشن جاری کرتی ہیں کہ جو تحقیق کو اور ہمارے مشکل بنا رہے ہیں مثلاً ابھی یہ قانون پاس ہوا ہے کہ جو بھی تحریر نظریہ پاکستان کے خلاف ہوگی اس کی سزا دس سال قید یا مشقت ہوگی ان حالات میں پاکستان کے اسکالرز کے لئے آزادانہ تحقیق ناممکن ہو کر رہ گئی ہے اور اس لئے اب وہ بھی ہماری تاریخ اور ثقافت پر نیا کام ہو رہا ہے وہ غیر ملکی پورے سبوں میں ہو رہا ہے۔

تحقیق پر ان دیکھوں کے لاپرواہی حکومتیں اپنی زندگی کو شاید بچا لیں۔ مگر معاشرہ کو جاہل اور گمراہ کر کے یہ قوم کے مستقبل کو اندھیرا بنا رہی ہیں اور جو قومیں اندھیرے میں ٹھک ذہن کے ساتھ پیدوش پاتی ہیں وہ دوسری قوموں سے کسی قسم کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔

جاگیردارانہ سیاست

بہبودستان کے جاگیرداروں اور امراء کے ہمدے میں ایک برطانوی فہرست ۱۸۶۰ء کی دہائی میں یہ لکھا تھا کہ مغلوں کے دور حکومت سے اس طبقہ میں یہ روایت رہی تھی کہ یہ اپنے خاندان میں کسی ایک فرد کو مسلمان ہونے دیتے تھے تاکہ اس طرح سے انھیں دربار کی حمایت مل جائے اور اس ایک فرد کی قربانی سے ان معاملات اور جائیدادیں محفوظ رہ جائیں۔ یہی حکم ۱۸۵۷ء کے بغاوت میں اس طبقہ کا کردار دیکھ کر ایک نئی خاندان کے کچھ لوگ پانچویں سے مل گئے اور کچھ برطانوی حکومت کے دلاوار رہے اور ان کی یہ پالیسی وقت کے ساتھ بدلی نہیں بلکہ اس طرح سے جاری رہی تاکہ ہر صورت میں ان کے خاندان کا تحفظ ہو سکے۔

اس لئے جاگیردار طبقہ کی برصغیر ہندوستان میں یہ تاریخ رہی ہے کہ انھوں نے بھی کسی کی مقصد، دشمن کی دشمنی اور اتحاد میں درجہ بندی کی۔ ان میں سے بعض نے برصغیر کے مفادات کا تحفظ ہوتا تھا، جب بھی کسی سیاسی جماعت سے رابطہ کرتے تھے تو ان سے ہم آہنگی کے لئے کہ اس جماعت کے اغراض و مقاصد اس کے ساتھ ساتھ ان کے مقاصد بھی حاصل ہوتے تھے اور اگر کبھی دو جماعتیں برابری طاقت ور ہوں اور ان کے اقتدار میں تسلسلہ نہ ہو تو ان کے ہونے تو اس صورت میں خاندان کے افراد دونوں جماعتوں میں شریعت اختیار کر لیتے تھے۔

جب بہبودستان میں برطانوی حکومت منظم ہو گئی اور اس کے خلاف کوئی سوڑ نہ چلتی رہی تو جاگیردار طبقہ نے مکمل طور پر ان کی حمایت شروع کر دی۔ ان کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے وہ ان کے دلاواروں میں شامل ہو گئے۔ جب ۱۸۵۷ء میں کانگریس قائم ہوئی تو بہبودستان کا جاگیردار طبقہ اس سے دور رہا کیونکہ انھیں یقین نہیں تھا کہ کانگریس کسی بھی طرح سے ان کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن جب بہبودستان میں قومی تحریکیں آہستہ آہستہ طاقت ور ہونا شروع ہو گئیں اور حکومت نے بھی ان کے مطالبات پر غور کرنا شروع کر دیا تو اس وقت اس طبقہ کے نوجوانوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ پتا چلا کہ یہ ہوا کہ ایک ہی خاندان کے کچھ لوگ حکومت کی ملازمت کر رہے تھے اور کچھ لوگ سیاسی میدان میں آ گئے اور اس طرح سے ماہرانہ انداز

میں انھوں نے توازن کو اپنے حق میں برقرار رکھا۔

اس کا ایک نتیجہ اور یہ نکلا کہ اردوئی کے بعد پاکستان میں اس طبقہ کے افراد نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ انھوں نے قومی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور ملک کی آزادی کے لئے مالی و اخلاقی قربانی دی تھی۔ اس لئے نہ صرف ان کی عزت کی جائے بلکہ اس مسئلہ میں انھیں مزاحمت بھی دی جائے۔

ملک کی تقسیم کے بعد جاگیردار طبقہ اس وقت تک مسلم لیگ کے ساتھ رہا۔ سب تک کہ وہ سیاسی طور پر مضبوط رہی اور اقتدار اس کے پاس رہا۔ مگر جیسے ہی مسلم لیگ کمزور ہوا تو اس میں درجہ بندی کی نہیں جاتا شروع ہو گئی تو اس طبقہ نے وہی اپنی پرانی پالیسی و حیلہ بازی سے اس صورت اختیار کر لی۔

پانچویں میں وقت پاکستان میں اس طبقہ کے لوگ فوج، پولیس، عدالتوں اور دیگر اداروں میں جگہ جگہ اختیار کر لی تھیں۔ ان میں سے کئی نے ان کے لئے کبھی یہ مسئلہ نہیں دیکھا کہ کون سی جماعت اقتدار میں ہے اور کس قسم کی حکومت قائم ہے یہی صورت ہے کہ مارشل لا۔

پتا چلا کہ یہ طبقہ ہر گروپ اور ہر نظام میں طاقت ور ہوا ہے اور سیاست میں موثر کردار ادا کرتا ہے اس لئے کوئی بھی حکومت قائم نہیں کرتے وہ معاشرہ کے سیاسی سماجی و درمیانی درجہ کے لوگوں کو بدلتے کی کوئی کوشش نہیں کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ حکومت بھی کہ جو حوصلہ ازم کا فساد کرنا کرنا شروع کر دیتی تھی وہ بھی جاگیرداروں کے خلاف کوئی اصلاحات نہیں کر سکتی۔ اور وہ تمام سیاسی ادارے چھوڑ کے باوجود دہشتوں میں اپنی جگہوں کو مضبوط کر رہے ہیں اپنی جگہوں کی حفاظت میں تحفظ اور امن و امان کی دنگی کر رہے ہیں ملک کی تقسیم کے بعد یہ طبقہ ہے اور ان کے اختیارات پر مبنی ہے اور ان کا یہ خیال ہے کہ ان کی جاگیروں اور وصافی علاقوں میں اس لئے رہتا ہے کہ ہر سیاسی جماعت و انکسپشن جیسے سے لئے ان کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس لئے پتا چلا کہ تقریباً تمام سیاسی جماعتوں نے جاگیرداروں کا تحفظ ہے۔ چونکہ ان کا کسی قسم کا کٹ نہ ہو رہا ہے اس لئے ان کے لئے کچھ مشکل نہیں ہوتا کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات میں تبدیلیاں کر سکیں۔ کبھی سوشلسٹ ہو جائیں۔ کبھی سیکولر اور کبھی مذہبی اور اسلام سے دہانہ اور ان سے یہ بھی کبھی مسئلہ نہیں رہا کہ وہ اپنے پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹیوں کو اختیار کر لیں۔ اس لئے پاکستان میں اب یہ کوئی عجیب کی بات

میں دی ہے کہ ایک ہی شخص ایک وقت میں سوشلسٹ تھا اور وہی شخص کچھ عرصے میں
 بنیاد پرست بن گیا اور اس پر مذہب کی طوایاں اچانک واضح ہو گئیں۔ سیاسی موقع پرستی اس
 طبقہ کی وہ اہم خصوصیت ہے کہ جس پر یہ غور کرتے ہیں۔

سیاسی جماعتوں میں جاگیرداروں کے تسلط کی وجہ سے یہ جماعتیں ایسے کوئی منشور میں
 بتاتیں کہ جو ان کے مفادات کے خلاف ہوں اور کھڑا کوئی منشور سازی ہی نہیں کرتیں۔
 کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ انکسٹن جیتنے کے لئے منشور سے زیادہ جاگیردار کا اثر و رسوخ
 ضروری ہے۔ کیونکہ تقسیم سے پہلے اس روایت کی ابتداء مسلم لیگ نے کر دی تھی اور
 صرف انہیں جاگیرداروں کو ٹھٹھکے تھے کہ جن کا جیتنا چاہی تھا۔ اس لئے انکسٹن میں
 وہ مسل پائیں جس کی بلکہ جاگیردار جیتنے ہیں۔

یہ جاگیردار سیاستدان عوام کے ساتھ دھوکہ کرتے ہیں اور خود جاگیردارانہ سیاست
 میں اتنا لہر دوں کی نشان دہی کی جاتی ہے مگر بہت جلد یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے
 گناہوں کو محض گردہ جانے اور انہیں معاشرہ اور تاریخ میں باعث مقام دینا ہے۔ اور
 کام بھی خود جاگیرداروں پر اس لئے ہے کہ ان کے طبقہ کی تصویر منافی سمجھی رہے
 اس کا ایک مثال سندھ کے جاگیردار رہا ہے۔ ایم۔ سید نے دی جاسکتی ہے جو انہوں
 نے ۱۹۶۹ء میں سندھ شہر محلہ کے پبلک فارم سے کی تھی اور اس میں انہوں نے دن
 یوٹ کے نتیجے میں ہونیوالی غریبوں کا ذکر کیا تھا کہ جس سے سندھ ویدوار ہوا تھا اس
 موقع پر انہوں نے ایوب کھوڑو کی شخصیت کو دوبارہ سے بھڑکانے کی کوشش کی جب وہ
 دن یوٹ جیتنے میں سب سے آگے تھا لیکن جی۔ ایم۔ سید نے اس کی دن یوٹ کی
 سیاست کو خطرناک کر کے اس کے اس عمل کی تعریف کی کہ جو اس نے سندھ کی بجلی سے
 ٹھیکہ کے مسئلہ میں کی تھی اور اس کی تعریف کی کہ اس نے پاکستان کی تقسیم کے بعد
 کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر کے پر احتجاج کیا تھا اور جی۔ ایم۔ سید کے مطابق اس دن
 یوٹ جیتنے میں حصہ تو لیا مگر اسے اس کا احساس نہیں تھا کہ اس سے سندھ کو کیا
 نقصانات ہوں گے لیکن جیسے ہی اسے اس کا احساس ہوا وہ دن یوٹ کے منصوبہ سے علیحدہ
 ہو گیا۔ جی۔ ایم۔ سید اور ان کے جاگیردار سیاستدان یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے تاریخ کے جیسے وہ
 کرتے ہیں کہ جب جس کو چاہیں عزم قرار دیں اور جب چاہیں اسے اعزت طور پر بری
 کر دیں۔ جب چاہیں کسی کو غدار کہہ دیں اور جب چاہیں وہ عجب وطن ہو جائے۔ اور یہ
 اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں معظوم ہے کہ اس جاگیردارانہ سیاست میں ان کی دیلوں کو

پہنچ کر دلا کوئی نہیں ہے۔

جی۔ ایم۔ سید نے اپنی اس تقریر میں ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر کیا کہ سب وہ پاکستان
 واپس آئے تو دن یوٹ کے خلاف تحریک میں حصہ لیا مگر جیسے ہی ایوب خاں نے انہیں
 وزارت کی پیش کش کی انہوں نے تحریک چھوڑ کر ایوب خاں کی پیش کش کو قبول کر لیا۔
 وہ بڑی وقار دہی کے ساتھ "مریت" کے لئے کام کیا اور جب ایوب خاں کا غلط جتلیج سے
 متاثر ہو تو اس میں بھٹو ایوب کی حمایت میں سب سے آگے تھے۔ اور جب ۱۹۶۵ء کی
 جنگ کے بعد ایوب خاں کی مقبوضہ کم ہوئی تو بھٹو اس کے مخالف بن کر عوام میں بھڑکے ہو
 گئے اور جب انہوں نے حکومت برٹانی تو ان کا وہ سارا درد کہ وہ انہوں نے ایوب خاں کی
 خدمت میں گدرا تھا وہ بھلا دیا گیا اور مدنی "کپڑے" اور مکان دلا بھٹو یاد رہا۔ اس کے
 بارے میں جی۔ ایم۔ سید کی یہ رائے ہے کہ اگرچہ وہ میر خاندان اور پیش و آرام کا
 دلدار تھا مگر اس نے صوبوں کی خاطر جیل کی کٹانیں اٹھائیں۔

اس کی ایک اور مثال پیر علی راشدی کی ہے جو سیاست میں اپنی موقع پرستی کی وجہ
 سے مشہور تھے اور جو ایوب خاں کو پاکستان کا بادشاہ بننے کا مشورہ بھی دے چکے تھے۔ وہ بعد
 میں بھی اس کے قائل تھے کہ پاکستان کے مسائل کا حل بادشاہت میں ہے۔ انہیں ہی کی
 تعریف کرتے ہوئے جی۔ ایم۔ سید نے کہا کہ انہوں نے ایوب خاں کی "مریت" کے خلاف
 ایک اظہار میں مسلسل آرٹیکل لکھے کہ جو ان کا قائل تعریف کا رہا ہے۔ اور جسے کسی
 نہیں بھلا دیا جاسکتا ہے۔

لہذا سیاست کے اس اہلکار چڑھاؤ میں اپنی موقع پرستی دھوکہ دہی اور عوام سے
 غدارانہ کے پانچویں جاگیردار سیاستدان آؤ عجب وطن اور عوام کے مفلس لہجہ سے میں
 کر بھرتے ہیں ان کے اصلی کردار اور اس کے خدوخال کو نمایاں کرنے والا کوئی نہیں ہوتا
 ہے۔

تعلیم کچھ کے لئے

ہندوستان کے معاشرے میں یہ ابتداء سے رواج تھا کہ امراء اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے اسکولوں یا مدرسوں یا ہائے شالہاں میں نہیں بھیجا کرتے تھے کیونکہ یہ صرف غریبوں اور نچلے طبقوں کے بچوں کے لئے ہوتے تھے اور امراء کے لئے یہ انتہائی کمیت ناک تھا کہ ان کے بچے نچلے طبقوں کے بچوں کے ساتھ کھل ملی کر تعلیم حاصل کریں۔ لہذا دستور یہ تھا کہ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت گھروں پر ہوتی تھی اور اس مقصد کے لئے مختلف علوم کے ماہرین کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ بادشاہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے محل میں انھوں قائم کر دیتا تھا کہ جہاں امراء کے بچے بھی ان کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

اس رجحان کا سنی اس وقت کے طبقاتی نظام سے تھا کہ جس میں طبقہ اعلیٰ و دارائی درجہ کے لوگوں میں کوئی ملتی جلتی تعلقات نہیں ہوتے تھے اور ان کے درمیان ایک فاصلہ برقرار رہا کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ استاد جو امراء کے بچوں کو ان کے گھروں پر حاضر کرتے تھے ان کی ملتی جلتی بھی ان مدرسوں کی طرح تھی جو ان کے مات میں قائم کرتے تھے۔ کیونکہ صرف علم اور حدیث کی جگہ جس میں کوئی ملتی جلتی نہ ہو اور حاکم کی تاج پر کسی شخص کا سایہ مل رہا نہیں ہوتا تھا۔

تعلیم امراء کے بچوں اور عام بچوں کے لئے علیحدہ علیحدہ ہوتی تھی کیونکہ امراء چاہتے تھے کہ ان کے بچے جنگی امور اور انتظامی معاملات میں مہارت حاصل کریں۔ لہذا استاد ان کو جنگی و انتظامی امور کی تربیت دیتے تھے۔ انھیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی کہ وہ سائنس یا فلسفہ پڑھیں۔ اس کے برعکس مدرسوں اور ہائے شالہاں میں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی اور یہاں بھی سکولر علوم کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا جاتا تھا۔ اس لئے اگر کوئی معمار "ارشاد" درست کرنا چاہتا تھا تو اسے کسی استاد کی خدمت میں شکر کے طور پر حکم کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح معاشرہ کے ہر طبقہ کے لئے تعلیم اس کے ملتی جلتی کے مطابق ہوتی تھی اور یہ معاشرہ کو حکمران و رعیت میں تقسیم کرتی تھی۔

برصغیر میں اسکولوں کا یہ نظام برطانوی عہد سے شروع ہوا چونکہ جاگیردار طبقہ برطانوی حکومت کا حامی رہا اس لئے حکومت کی یہ خواہش تھی کہ اس طبقہ کے بچے اسکولوں میں تعلیم حاصل کریں کیونکہ گھروں پر تعلیم نامکمل رہتی ہے۔ درجہ اعلیٰ پڑھانے کے داخل میں بہت کچھ نہیں سیکھا جاتا ہے۔ ابتداء میں امراء نے اس کی سخت مخالفت کی اور اپنے بچوں کو

اسکولوں میں بھیجے نہ تھے کیونکہ اس سے ان کا ذاتی مرتبہ گھٹ جاتا تھا۔ لیکن برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ جاگیردار طبقہ جدید علوم حاصل کرے اور نئے نئے کھجے کیونکہ دوسری صورت میں یہ حال ہو جائے اور اپنی مراعات کی حفاظت نہیں کر پاتے۔ اس لئے انھوں نے ان کے بچوں کے لئے خاص خاص سکولیں رکھیں۔ مثلاً انھیں اس بات کی اجازت تھی کہ وہ جیتنے والے ملازم رکھیں۔ انھیں کسی قسم کی جسمانی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ یہ امراء کے لئے سب سے بڑی بے عزتی تھی کہ استاد ان کے بچوں کو زد و کوب کرے جو کہ ملتی طور پر ان سے کم تر تھے۔ اگر اسکول میں رہائش ہوتی تھی تو ان کے لئے حدودی نہیں تھا کہ وہ سب بچوں کے ساتھ بیٹھیں جیسا کہ عام سکول میں ہوتا۔ انھیں یہ اجازت تھی کہ وہ اپنے پارہری ملازم رکھیں اور اپنا کھانا علیحدہ سے کھائیں۔

بعد میں بھارت پور کے برطانوی ریڈیٹ کرل و سٹرن نے یہ مشورہ دیا کہ راجہ گاندی کی رائے سے اعتراضات کے لئے علیحدہ سے ایک اسکول کھولا جائے کیونکہ صرف اسی صورت میں ہم ایسے طالب علم پیدا کر سکیں گے جو کمال کیڑا نہ ہوں بلکہ صحیح معنوں میں انقلاب ساز ہوں اور سکولوں اور دوسری قسموں میں بیٹھ چڑھ کر حصہ لیں۔ کیونکہ ضرورت یہ ہے کہ ان کی تربیت اس طرح سے کی جائے کہ یہ ایک طرف اپنی رہائی کی خاطر اس کے لئے کام کریں اور دوسری طرف انگریزی حکومت کے وفادار رہیں۔ اس میں سے جب ہندوستان میں ملتی جلتی اسکول کھولے گئے کہ جو صرف امراء کے بچوں کے لئے تھے اور جہاں عام لوگوں کے بچوں کو داخل نہیں کیا تھا۔

لیکن انگریزوں کی یہ کوشش کہ امراء کے بچے جدید تعلیم حاصل کر کے جدید علوم و نظریات سے واقف ہو جائیں اور حکومت کے معاملات میں ان کی مدد کریں یہ باقلم ہوئی کیونکہ امراء کے یہ بچے وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے کہ جو انھیں انتظامی امور کی تفہیم کو سمجھانے میں اور جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنے میں مدد دے سکتی تھی۔ لہذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کا حوصلہ تعلیم یافتہ آگے "یا" اور اس نے امراء کو قومی تحریک کی رہنمائی سے علیحدہ کر کے خود اس کو متبطل اور برطانوی حکومت سے تعاون کرنے کے بجائے اس سے آزادی کا مطالبہ کیا۔

مگر آزادی کے بعد ہندوستان میں تو یہ حوصلہ طبقہ برمراتدار آیا کہ جس نے ملک کو جمہوری اور سکولر راستے پر چلایا۔ مگر پاکستان میں چونکہ آزادی کے بعد حوصلہ تعلیم یافتہ طبقہ طاقت ور نہیں تھا اس لئے یہاں جاگیرداروں نے راجہائی سنبھالی اور ملک کو قدامت پرستی اور پس ماندگی کی طرف سے گئے۔

تعلیمی اداروں میں تشدد

ہر معاشرے میں تعلیمی اداروں کی اس لئے اہمیت ہوتی ہے کہ یہ وہاں پر علم کے بدلے ہوئے ملاحات اور نظاموں کے تحت تربیت دینے میں یہ سے حیثیت، خیرات اور انکار کا مرکز ہوتے ہیں کہ جو معاشرہ میں تہذیبی کے جذبہ کو ابھارتے ہیں اور اس کی تعمیر نو کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس لئے تعلیمی اداروں میں استاد اور طالب علم و فکر اور نئے نظریات کو فروغ دینے والے ہوتے ہیں۔ طالب علم کہ جس کی نگاہیں مستقبل پر ہوتی ہیں وہ بدلنے انکار و خیالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کی فروسکی کو دھار کرے اس کے جہود کو قذے اور معاشرہ کو نئی قدروں اور روایات پر تعمیر کرے اس کی روحانی اس میں جذبہ خوش اور جرات کو پیدا کرتی ہے۔

وہ وہ رہنمائی سے آزاد تصورات کی دنیا کو عملی دنیا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

تعلیمی اداروں کی اس اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے مصلحتی اساتذہ اور سربراہان اس بات کی کوشش کرتی ہیں کہ ان اداروں کے اس انتظامی کردار کو ختم کر کے انہیں حکومتی ریاست و قدر سے پرہیزگارے کا رویہ بنا دیں۔ اسی لئے کاشت اور آمرانہ حکومتوں میں سب سے زیادہ پابندیاں اساتذہ اور طالب علموں پر ہوتی ہیں اور تعلیمی ادارے جاسوسوں اور غلوں سے بھر جاتے ہیں کہ جن کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ علم و ادب کی بجائے کھل دیا جائے ہر اس تقریر و تقریر کو دبا دیا جائے جس میں آزادی، حمت اور تہذیب کی بات ہو اس کے لئے اساتذہ کے تقریر طالب علموں کے داخلہ اور خاص طور سے نصاب تعلیم کو دبا دیا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں پر ان پابندیوں کے نتیجے میں یہ آمرانہ حکومتیں تو شاید طویل ہو جاتی ہیں مگر یہ پابندیاں معاشرہ کی حقیقی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھل کر رکھ دیتی ہیں اور ذہنی طور پر اسے دیران اور بھر کر دیتی ہیں اس کی ایک مثال ہم عصر آمرانہ میں جرمی کی ہے کہ جس کی کاشت پالیسیوں کی وجہ سے ہاں کے تعلیمی ادارے دیران ہو گئے اور باصلاحیت اساتذہ کی اکثریت جرمی چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں آباد ہو گئے۔ وہ جو رہ گئے وہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکے اگر دیکھا جائے تو یہ کچھ تیسری دنیا کے ان ملکوں میں اور خصوصیت سے پاکستان میں ہو رہا ہے کہ اساتذہ اور باصلاحیت افراد اپنی ذہنی و تحقیقی کوشش کے لئے ملک چھوڑ کر بیسے معاشرہ کو فائدہ پہنچا رہے ہیں کہ جمعی آزادی خیال و اظہار ہے اور اگر یہی صورت حال رہی تو ہمارے تعلیمی

ادارے ہر قسم کے تعلیمی عمل سے برا ہو جائیں گے۔ اور ہم اس قابل نہیں رہیں گے کہ معاشرہ کی فروسکی کو پہنچ کر لیں اور شاید یہی مقصد و غشا ہمارے حکمران طبقوں کا ہے۔

انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں جس قسم کا نصاب رائج تھا اور اس کے نتیجے میں جو طالب علم تربیت پاتے تھے اس کا معاشرہ کے بھرنے ہوئے اور پڑھتے ہوئے ملکی سطح کی سے کوئی تعلق نہیں تھا اسی لئے یہ لوگ نہ تو معاشرہ کے نڈال کے عمل کو سمجھ سکے اور نہ ہی تہذیبوں کی اہمیت سے واقف ہو سکے فرسوں مضامین جو اس کی تعلیم نے انہیں بھی ذہنی طور پر پس مانا وہ فرسوں کر دیا۔ ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں اس وقت تبدیلی آئی جب یہاں انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا اور ان کی حیرت و حیرت سے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ہندو کا نظام تعلیم تبدیل کریں اس کے نتیجے میں جو تعلیمی ادارے قائم ہوئے اس میں ایک اب نصاب تعلیم تھا کہ جو انکسار کے رویہ کو سنبھل سکے اگرچہ اس میں اس بات کی کوشش کی گئی تھی تعلیم یافتہ نسل میں بڑی کوئی تحقیقی صلاحیت زیادہ نہ ابھری اور وہ صرف انتظامی ضروریات کو پورا کریں مگر اس کے باوجود جب انگریزی زبان سے بولنے لگیاں و انکار سامنے آئے تو اس نے ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقوں کے دامن کو بدل کر رکھ دیا اور ہیوم، انتہا، دائرہ، دوسرے کے ملکہ و مالی تفسیروں کے انکار اور ملکی علوم کے لئے نظریات نے علم و ادب کی ایک اور نئی دنیا دیوانہ کی اور اس مضامین تعلیم یافتہ نسل نے آگے چل کر انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں حصہ لیا یہ اس نصاب تعلیم کا نتیجہ تھا کہ برطانوی عہد کے طالب علموں میں جوہریت، انسانی حقوق اور روشن خیالی کے خیالات پیدا ہوئے اور اصول نے اس جذب سے سرشار بنی تاریخ و ثقافت کی بڑیاں تلاش کیں۔

برطانوی عہد میں تعلیمی اداروں میں نصاب کے ساتھ ساتھ غیر تعلیمی سرگرمیوں پر بھی خصوصی توجہ دی گئی اور مختلف کلیوں اور سوسائٹیوں کے ذریعہ بحث و مباحثہ، علم و ادب، موسیقی، ڈرامہ اور کھیل کو فروغ دیا تاکہ طالب علم نسائی و غیر نسائی دونوں طرح سے خود کی تربیت کر سکے۔ تعلیمی اداروں کے تقدس کے پیش نظر برطانوی عہد میں پولیس کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ ادارے کے سربراہ کی اجازت کے بغیر اس کے چار دیواری میں قدم رکھ سکے یا کسی طالب علم کو گرفتار کر سکے۔ ان تحفظات کی وجہ سے تعلیمی اداروں کا نہ صرف تقدس قائم ہوا بلکہ اس نے اساتذہ اور طالب علموں کو آزادی اور خود مختاری

دن کہ وہ اپنے حیات کا اظہار کر سکیں۔ اسی لئے ان میں اور عوام میں ایک مگرارشت قائم ہو۔ کیونکہ عوام ان تعلیمی اداروں کو اس لئے احرام کی نظر سے دیکھتے تھے کہ یہاں وہ لوگ تھے جو نہ صرف مستقبل کے معاشرے کی تعمیر کے ذمہ دار تھے بلکہ جو عوام کے لئے اپنی عملی طور پر اڑنے اور پرواز کے لئے بھی تیار رہتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد تعلیمی اداروں کا یہ ڈھانچہ اور یہ روایات ساتھ میں آئیں۔ اس لئے اس ابتدائی دور میں طالب علموں نے جمہوری حقوق کی بدولت میں حصہ لیا اور جب بھی ہمارے حکمرانوں نے سازش اور گتہ جوڑ کے ذریعہ سیاسی تبدیلیاں کیں۔ اور جمہوری روایات کو پکڑا تو انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھایا۔ 1947ء کی دہائی میں طالب علموں کی یہ جدوجہد اس لئے قابل ذکر ہے کہ یہ ملک میں آزادی رائے اور جمہوری حقوق کے لئے کی گئی تھی اور اس لحاظ سے طالب علموں کی سرگرمیاں ہمارے ان حکمرانوں کے لئے ناقابل برداشت تھیں کہ جو عوام کی رائے اور ان کے ووٹ کو ہلانے والے تھے کہ اقتدار میں رہتا چاہے تھے۔ اسی لئے اس زمانہ ہی میں طالب علموں پر پہلی مرتبہ قاتلک بھی کی گئی۔ اور انہیں جیلوں میں بھی بٹھا دیا، مگر اس کے باوجود ان کی تحریک کو دبا نہیں سکے۔

پانچویں نسل کی سیاست کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں میں اس وقت تبدیلی آئی جب ایوب خان نے مارشل لاہ کے ذریعہ حکومت پر قبضہ کر کے اپنی آمریت کو قائم کیا۔ چونکہ ایک آمر کو سب سے زیادہ خطرہ سیاسی طاقت کا ہوتا ہے اس لئے اس کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان تمام راسخوں کو بند کر دیا جائے کہ جو سیاسی طاقت کو پیدا کرنے کی وجہ بن سکتے ہیں۔ اس ضمن میں تعلیمی ورے بھی آئے۔ اور اس بات کی کوشش ہوئی کہ ان کے جمہوری کردار کو ختم کر دیا جائے تاکہ یہاں سے نہ تو نئے فکرات پیدا ہوں اور نہ تبدیلی کے خواہش مند طالب علم۔

چنانچہ اس سلسلہ میں تو بنیادی باتیں ہی گئیں وہ یہ تھیں کہ طالب علموں کو غیر سیاسی بنا دیا جائے۔ تاکہ وہ حکومت کے لئے خطرہ نہیں رہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں اس بحث کا اظہار ہوا کہ ”طالب علموں کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے کہ نہیں“ حکومت کے حامی خورشیدی دانشوروں نے اس پر فوراً فیصلہ دیدیا کہ طالب علموں کے لئے سیاست ایک خطرناک چیز ہے جو ان کی تعلیمی سرگرمیوں میں رکاوٹ بنتی ہے لہذا طالب علموں کو صرف اپنے نصاب پر توجہ دینی چاہئے۔ غیر سیاسی بنانے کے اس عمل کے ذریعہ تعلیمی اداروں میں تمام ”طالب علم یونین“ ختم کر دی گئیں اور طالب علموں میں انتخاب جو کہ جمہوری

روایات کے لئے فوراً کا باعث قرار دیا گیا۔

اس کے بعد صاحب تعلیم کو تبدیل کرنے کا عمل شروع ہوا اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ نئی نسل کے ذہنوں میں جمہوری انداز کے لئے کوئی جذبہ پیدا نہ ہو بلکہ ”ہیرو“ کی بجائے ”ہیرو“ بن جائے۔ یہاں پر تعلیم کو نظروں سے اوجھڑا کر ”حب الوطنی“ اور ہیرو کے کارناموں کے ساتھ ساتھ ”حب وطن“ کے خاتمہ کے بعد جب تعلیمی اداروں سے غیر تعلیمی عناصر کو خارج کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان اداروں کی زندگی اور انہیں دیرانہ و غیر ہو گیا۔ اس کے بعد اس میں اس حد تک رشتہ قائم رہ گیا کہ بہت سے طلبہ اس دور میں اس دور میں رہ گئے۔ مگر میں نے ایک بار اس دور میں رہنے سے یہ بھی دیکھا کہ اس نے استاد اور طالب علم کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ اس دور میں تعلیمی ورے سے مباحثوں، سوچیں اور رائے کے ذریعہ تعلیمی اداروں میں ایک انقلاب ہوا جس نے طالب علموں کی زندگی کو

بے چین کر کے رکھا۔ اس میں تعلیمی اداروں کے مقدس کا اس طرح سے خاتمہ ہو گیا کہ ان میں پولیس اپنی عرصی سے داخل ہونے لگی اور طالب علموں اور اساتذہ کی پہلی بھی میں گرفتار کر کے بھی لے جانے لگی۔

تعلیمی اداروں کے ڈھانچہ اور کردار میں اس وجہ سے بھی تبدیلی آئی کہ جب ملک میں سرگرمیوں پر پابندی لگی اور سیاسی جماعتیں اس قابل نہیں رہیں کہ جلسوں اور ریلیوں کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں تو انہوں نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے طالب علموں کا سہارا لیا اور ہر سیاسی جماعت نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ طالب علموں میں اپنی جماعت بنائے اور اس کے ذریعہ تعلیمی اداروں پر قبضہ کر کے خود کی سیاسی اہمیت کو قائم کرے۔ چنانچہ ان سیاسی جماعتوں کی پیدا کردہ طالب علم جماعتوں نے یونین کی جگہ لے لی مگر چونکہ ان کا مقصد تعلیمی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں کو فروغ دینا نہیں بلکہ اپنی اہمیت کو قائم کرنا تھا اس لئے انہوں نے اس مقصد کے لئے طاقت، دولت اور لشکر کا ذریعہ استعمال کیا اور اس نے ان جماعتوں میں تہذیب کی فضا کو پیدا کیا۔ کیونکہ سوائے طاقت کے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ جس کے ذریعہ وہ اہمیت قائم کر سکتے۔ چنانچہ ان طالب علم جماعتوں میں بھی فاشٹ اور سموزہ روایات پیدا ہوئیں جنہوں نے طالب علموں کو جمہوریت، انسانی حقوق اور مغربوں کی حمایت سے دور کر دیا۔ چنانچہ ایوب خان کے بعد

روایات کو گزور کر دیا کہ جو جمہوری معاشرہ کے قیام میں مدد دیتیں۔

پاکستان میں کیوں جمہوریت قائم رہی اور یہاں کیوں آسانی سے فوجی حکومتیں اور سحر آئے رہے؟ اس سوال کا جواب ہماری تاریخ کے اندر ہی چھپا ہوا ہے پاکستان بننے کے فوری بعد مسلم لیگ مطبوعہ جماعت کی حیثیت سے ابھری اور اس نے اپنی حکومت بنائی لیکن ساتھ ہی اس نے کوشش کی کہ اس کی حکومت بغیر کسی مخالفت کے بیچ کے لئے قائم رہے اور وہ کسی بھی دوسری جماعت کو قعرہ میں نہ تو شریک کیا جائے اور نہ اسے موقع دیا جائے کہ وہ اقتدار حاصل کر سکے اس لئے حزب اختلاف کہ جو جمہوریت کے لئے انتہائی ضروری ہے اسے ابھرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اور اپنے خلاف کسی تنقید کو برداشت نہیں کیا گیا۔

مذاہب اور حکومت کے درمیان جو عظیم تضاد ہوتا ہے ان دونوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا اور اسی لئے ہر مخالفت کو غداری کے مترادف قرار دیا گیا۔ اگرچہ ان تمام مخالفتوں کے باوجود دوسری سیاسی جماعتیں نہیں مگر ان کا ذخائر بھی سیاسی قیام دیا جیسا کہ مسلم لیگ کا تھا اور ان میں بھی چند لوگوں کی ایجاب داری رہی اور عام سیاسی کارکنوں کو نفسی اس کا موقع نہیں دیا گیا کہ اس کو زائفا نکلیں اور اس کے بڑھ سکیں۔

پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے نوآبادی روایات کو جاری رکھا اور حکومت کے تمام لوگوں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس میں ایک روایت یہ تھی کہ پیوروکریسی کو اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ سیاست میں حصہ لے۔ بلکہ اس کے کردار کو اس طرح سے ڈھال دیا گیا کہ وہ ہر اس حکومت کی رفتار دہے کہ جو قانونی ہو یا غیر قانونی مگر جس کے پاس اقتدار ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ کا تعلیم یافتہ طبقہ جو پیوروکریسی میں جانا ہے اسے سیاست میں حصہ لینے کے بنیادی حق سے محروم کر دیا گیا۔

اس طرح پیوروکریسی کاغ اور تعلیمی اداروں کے ساتھ کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ نیشنلائزیشن یا کسی سیاسی جماعت کے رکن بن سکیں، اسی کو فوجی اداروں اور غرضوں نے اپنے ہاں دوا کر دیا۔ چنانچہ وکیل 'ڈاکٹر' تاجر اور جاگیردار طبقے باقی رہ گئے کہ جو سیاست میں حصہ لے سکتے تھے۔ ان میں سے جاگیردار طبقہ کو سیاست میں آنے اور اس پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کا موقع اس لئے ملا کہ اس کے پاس دولت، وقت اور طاقت تینوں چیزیں تھیں۔ وہ سیاست لان کے لئے ایک ایسا پیشہ بن گیا کہ جس کے ذریعہ وہ دولت اور طاقت

دونوں میں اور اضافہ کر سکتے تھے۔ لہذا جاگیردارانہ سیاست کی وجہ سے پاکستان کی سیاست میں جمہوری ورے مزید گہرے ہو گئے۔ ان کی رجحانیت دولت کا اعتبار اور طاقت نے ایک عام سیاسی کارکن کو ان کے ہاتھوں میں کہ چلی ہمارا کر رکھ دیا کہ جس کی اپنی کوئی آواز اور رائے نہیں رہی۔

پاکستان میں جمہوریت اس وجہ سے اور بھی گہرے ہوئی کہ نہ تو یہاں دستور بنانے کی طرف توجہ دی گئی اور نہ ہی عام انتخابات کرائے گئے جس کی وجہ سے لوگوں کو یہ موقع نہیں ملا کہ وہ سیاسی امور میں حصہ لیتے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ آہستہ آہستہ بے حس اور لاپرواہ ہوتے چلے گئے اور حالات کو خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ اگر حکومتیں بدلتی بھی نہ رہ سالا شیوں کے ذریعہ بدلتی لوگوں کی خواہشات اور مرضی کے مطابق نہیں۔ اور جو بھی نئی حکومت آتی اس کا پہلا حکم یہی ہوا کہ مگر طرح سے مخالفت کو ختم کیا جائے اور تہذیبی لوگوں کو اپنا وقار بنایا جائے۔ اس کا سب سے بڑا شکار اخبارات رہے اور انہیں آزادانہ تنقید کرنے کے مواقع نہیں دیے گئے۔ رہے لی۔ دی اور ریڈیو تو وہ حکومت کے وارے تھے۔ اس نے وہ حکومت کے لئے پھونکے گئے جو اور کچھ نہیں کر سکے۔ اگر کسی جماعت اور گروپ نے مظاہرہ کر کے کی جرات کی تو اسے سختی سے روک دیا گیا اور ضرورت سمجھی گئی تو گولی چلا دے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔

یہ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں ہو کہ جب جمہوری حکومت قائم تھی اور قعرہ ایک سیاسی جماعت کے ہاتھوں میں تھا۔ لیکن اس سیاسی جماعت نے خود اپنے ہاتھوں اپنا گام گھونٹا اور جب جمہوری لوگوں کو لٹولنا پڑا تو وہ پہنے کا موقع نہیں دیا تو ملک میں آخرت کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ اور جب ۱۹۵۸ میں ایوب خان کا رشل لاء لگا تو ملک میں اس کے خلاف کوئی مزاحمتی تحریک نہیں تھی۔ فریڈ یونین طالب علم، تاجر، پیوروکریسی اور دوسری سیاسی و ثقافتی جماعتیں خاموش رہیں۔ عام لوگوں نے رشل لاء کو اس لئے خوش آمدید کہا کہ جمہوری حکومت انہیں اپنے عمل سے دلوں کو بھلی تھی اور ان کی توقعات اس سے پوری نہیں ہو سکی تھیں۔

ایوب خان درحقیقت خان کے بعد توڑی مدت کے لئے ملک میں جمہوری حکومت قائم رہی مگر اس میں بھی بھڑکی رانی خواہشات اور جاگیردارانہ سیاست کی وجہ سے جمہوری روایات کو مضبوط کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ حزب اختلاف کو برداشت نہیں کیا گیا۔ پریس کی آزادی پھینک لی گئی، ریڈیو اور ٹی۔ وی کو لیڈر اور اس کی جماعت کے

پروٹیکشن کے لئے استعمال کیا گیا۔ طالب علموں اور جموں کی جماعتوں میں حکومتی پارٹی کے کارکنوں کو داخل کر کے ان کے کام میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں اور کوشش کی گئی کہ ایسی سچے مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اسی وجہ سے فوج کو ایک بار پھر موقع ملا کہ جمہوری حکومت کو ختم کر کے اقتدار پر قابض ہو جائے کیونکہ اسے جین تھا کہ اس پر عنوان جمہوری حکومت کی حمایت میں کوئی نہیں اٹھے گا۔ اور ہوا بھی یہی۔

فیصلہ الحاق سے گیارہ سال آرام سے حکومت کی کہ نہ تو کوئی ایسے جمہوری ادارے بنائے گئے تھے کہ جو اس کی حکومت کی مزاحمت کر سکتے اور جو ضروری بہت مزاحمت ہوئی تو اس نے اسٹیبلشمنٹ سے کل کو دھکا دیا اس نے سپریم کورٹ کو منظم کرنے کی غرض سے رپے سے جمہوری اداروں اور ریاست کو ختم کر کے اپنی حمایت کی غرض سے علاحدہ، مشائخ، تاجر اور جاگیردار طبقوں کو مراعات دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں صرف فوج ایک ایسا ادارہ رہ گئی کہ جو منظم تھا اور اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی طاقت اور اپنی مراعات کے لئے لوگوں کے سامنے اس کو بوسا چڑھا کر پیش کرے کہ ملک خطرے میں ہے۔ اور اس کا دفاع صرف فوج کر سکتی ہے۔ اور کوئی ادارہ اس قابل نہیں کہ ملک کی سیاسی و انتظامی سرحدوں کی حفاظت کرے۔

اس لئے جب سواں ہوا ہے کہ ملک کو کس طرح سے فوجی آمریت سے بچایا جائے۔ تو اس کا جواب یہی ہے کہ اگر معاشرہ میں سیاسی جماعتیں، گروہیں اور پارٹیاں مضبوط نہیں ہوں گی۔ رشہ پوئین اور طالب علم پوئین بائیں نہیں ہوں گی اور پولیس آڈیو نہیں ہو گا تو اس صورت میں آمریت قائم ہونے کے مواقع بڑھ جائیں گے۔ اور اس کو روکنے کا حل یہی ہے کہ ملک میں ہر سطح پر جمہوری اداروں کو قائم کر کے جمہوری روایات کو فروغ دیا جائے۔

اداری سیاسی جماعتوں کو ایک بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ جمہوریت میں کبھی بھی کسی ایک سیاسی جماعت کی حکومت بیش قائم نہیں رہتی ہے، الیکشن جیتنا اور ہارنا بھی ایک جمہوری روایت ہے۔ اس لئے ہر سیاسی جماعت کو الیکشن جیتنے کے ساتھ الیکشن ہارنے اور اس پر ہار کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔

دی۔ آئی۔ پی اور مراعات

جب کوئی معاشرہ انقلابی قدروں اور غریبوں سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ اس قدر بے ہمت ہو جاتا ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیتیں اس قدر دب جاتی ہیں کہ اس میں کوئی جان نہیں رہتی ہے اور اس میں یہ توانائی اور قوت باقی رہتی ہے کہ وہ دنیا کی تدریب و تمدن میں کچھ اضافہ کر سکے۔ ایک ایسے معاشرہ میں علم، ادب، دانشور، ریاست، فن آرٹ اور انجمنیاری کی کوئی قدر باقی نہیں رہتی اور صرف طاقت و دولت ایسے اوصاف ہوتے ہیں کہ جن کی لوگ قدر کرتے ہیں اور جن کی عزت کی جاتی ہے۔

اور جن افراد کے پاس دولت اور طاقت ہوتی ہے وہ دانشوری اور علم و ادب کی صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں اور اس قابل نہیں ہوتے ہیں کہ آئٹ، ادب میں کچھ بھی اضافہ کر سکیں، اس کو سمجھ سکیں۔ ان لوگوں کی ذاتی سطح اس قدر کم ہوتی ہے کہ اگر ان کے پاس سے دولت اور طاقت نہ رہے تو وہ ایک عام آدمی کی سطح پر آجائیں، کیونکہ دولت اور طاقت ہر انہیں خاندان سے دور میں ملتی ہے نہ تو ان کی ذاتی سطح کو بلند کرتی ہے اور نہ ان میں کوئی صلاحیت پیدا کرتی ہے، اس لئے ان وہ چیزوں کے بغیر ان کی شخصیت متاثرہ کے لئے ایک بوجھ ہوتی ہے کیونکہ صرف دولت اور طاقت ان کی کمزوریوں اور بد خصلتوں کو بچھاتی ہے۔ پل ذاتی کمزوری اور کھوکھلی پن کو چھپانے کی خاطر یہ لوگ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ادب، جواب کی دسمات کے ذریعہ وہ لوگوں سے اپنی عزت کر سکیں۔

ہندوستان میں مغلوں کے آخری زمانہ میں بھی جب کہ بادشاہ اپنی سیاسی طاقت کو بیش تھا اور امراء کے پاس بھی دولت و اقتدار نہیں رہا تھا۔ تو اس کے ساتھ ہی معاشرہ میں ان کا سماجی مقام بھی گر گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے لوگوں سے اپنی عزت کرائے کے لئے مراعات اور آداب پر زور دینا شروع کر دیا۔ محل بادشاہ جو انگریزوں کے ہاتھوں میں آگیا بن کر رہ گیا تھا، اپنی ظاہری آن بات کو برقرار رکھنے کے لئے اس بات پر اصرار کرتا تھا کہ انگریز ریڈیڈنٹ اسے تسلیم کرے اور گورنر جنرل بجا دے اور برطانوی سربراہوں کو دربار میں بیٹھنے کی مراعات سے انکار کرتا تھا، لیکن ان مراعات پر اصرار کرتا اس لئے بیکار طاقت ہو کہ اس کے پاس نہ کوئی طاقت تھی اور نہ اس کی کوئی مضبوط حیثیت تھی، اسی لئے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مراعات کھلی رہیں یہاں تک کہ وہ اس مرحلہ پر آگیا کہ جہاں اس کی

ضرورت ہی نہیں رہی

مطل امراء کا بھی یہی حال تھا کہ جیسے جیسے ان کی سیاسی اور معاشرتی حالت گزری تھی اس طرح وہ اپنے سماجی مرتبہ سے بلند میں جاس ہوتے جاتے تھے اور اب وہ ان کے معاملہ میں سال رکھتے تھے۔ ان میں ایک چپ مثال مردانہ ہے۔ انہوں نے کالج میں محض اس نئے ماحول میں کی کہ پرچل ان کے استقبال کے لئے کھڑے نہیں آئے۔ اس لئے انہوں نے یہ گوارہ کر لیا کہ وہ طاقتور نہ کریں۔ انہوں نے یہ گوارہ کر لیا کہ وہ اپنے سماجی مقام کم نہ ہونے دیں۔

انگریزی عہد میں مغل عہد کے امراء طاقت و دولت کھونے کے بعد اپنے خاندان پر دندہ تھے اور اسی بنا پر لوگوں سے اپنی عزت کو دانا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ خاندان اور ذات کے بارے میں کوئی سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اور ان سے بعض تو اپنی عزت اور مفاسد کے باوجود پچھے پچھے سے نفرت کرتے رہے اور ان کے ساتھ کھل چاپ کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

مطل وارشاد اور امراء جس بات کو نہیں سمجھ سکتے وہ یہ کہ جب وہ اپنے عوام کو چھوڑ کر اور انہوں نے خطرات سے محفوظ نہیں رکھ سکے اور ان کے حال و حال کو نہیں دیکھ سکتے تو اس صورت میں لوگوں میں ان کی کوئی عزت نہیں رہی۔ اور جب ان کا خاتمہ ہوا تو کسی کو بھی ان کی موت کا افسوس نہیں ہوا۔

یہی کچھ صورت حال پاکستان کے عسکری طبقہ کی ہے کہ ان میں نہ تو ذہانت ہے نہ ایمان داری اور نہ ہی علم و ادب سے ان کا واسطہ ہے اور نہ ہی ان میں کوئی ہنر و فن ہے۔ اور اس پر ستم یہ کہ یہ لوگوں سے معاف کرتے ہیں کہ ان کی وہ شخص اس نئے عرصہ میں کہ ان کا سماجی مرتبہ بدلتا ہے ان کے ذریعہ کئی ہوئی دولت اور طاقت کی وجہ سے بلند ہے۔ یہ خود کو لوگوں سے بلند کرتے ہوئے اپنے لئے دی۔ آئی۔ بی۔ اور وی۔ ڈی۔ آئی۔ بی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے چہرے سرسے چال و عمل اور ظاہری شکل سے یہ نفسی کوئی بد خلقی نظر نہیں آتے، لیکن جب یہ مراعات طلب کرتے ہیں اور غور کو دی۔ آئی۔ بی ظاہر کرتے ہیں تو اس وقت ان کے سماجی مرتبہ کا پتہ چلتا ہے اور اس طرح سے یہ اپنے دہی کھولتے ہیں اور اس انتہی کو مراعات کے ذریعہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے یہ اس بات کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ کون انہیں سلام کرتا ہے اور کون ان کے آگے جھکتا ہے یہ ان باتوں پر بھی غور کرتے ہیں کہ جب انگریزوں نے یہ سیکورٹی، فیس کی

مٹا دی گئی ہے، پاکستان کا مستقبل ان کو خلاف ورزی پر قہرنا ہے۔ ان کے لئے رہنے کے ایجنڈے اور ایجنڈوں میں پیچیدہ سے گھرے ہوتے ہیں، کچھ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر جگہ ان نفسانیت سے خود کو غارت مٹا کر نکھیں۔ اور انہوں نے اس مسئلہ میں تاریخ کا نظام مغل امراء کے ساتھ دیکھ لیا ہے۔ وہ اس انتظار میں ہیں کہ پاکستان پاکستان کے عسکری طبقہ کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔

مغل امراء کا خاتمہ اور ہمارے حکمران طبقے

اور گھنٹہ کی دقات کے بعد ہندوستان میں مغل خاندان کا زوال شروع ہوا اور آہستہ آہستہ بادشاہ کی ذات جو حالت و قوت کا سرچشمہ ہوتی تھی، وہ گھٹنا شہر ہو گئی اور امراء کی حالت میں وہ بالا تر کہ پتل بن کر رہ گیا۔ اور اس کے ساتھ خود مغل امراء جو اب تک ایک جماعت کی حیثیت سے تقسیم ہو کر کئی گروہوں میں بٹ گئے اور اقتدار میں سے کے لئے اصولیئے سازش اور کٹھ جوڑ کا ایک نہ ختم ہون والا مسودہ شروع کر دیا کہ جس میں خاندان جنگی اور تخت نشینی کے ٹکڑے شامل تھے۔ ان میں سے جو گروہ بھی برسر اقتدار نہ رہا، تو اس کی پوری کوشش ہوئی تھی کہ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دست کش کرے اور اپنے مخالفوں کو جس قدر نقصان پہنچا سکے وہ پہنچا لے۔

اس پورے عمل میں مشاورہ کی اطاعتی قدریں اور روایات اس طرح سے پروان چڑھیں کہ ظاہری طور پر معاشرہ پر سکون دکھائی دیتا تھا مگر اس کے اندر ہی نہ بدیلیاں آ رہیں تھیں۔ اس دور کی ایک اہم خصوصیت مخالفت تھی۔ کہ امراء کے دیگر وہ جہ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے مگر دیکھو کہ اس دور پر وہ ایک دوسرے سے بڑی خوش اخلاقی سے ظاہر کرتے تھے جن میں ہر صاف طور پر وار کرنے کا رواج نہیں تھا بلکہ اس کے لئے بیٹھ سازش کی جاتی تھی اور غیبی طریقوں سے اسے ڈک پہنچائی جاتی تھی۔

امراء کے ہر گروہ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ افراد کی حمایت حاصل کرے اس لئے ہر امیر اس مدد کے عوض جاگیر حاصل کرنا چاہتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے پاس جو خالی جاگیریں تھیں وہ بہت جلد نئے امیروں میں تقسیم ہو گئیں لیکن امراء کی تعداد برابر بڑھتی رہی اس لئے یہ کیا گیا کہ خلیفہ دہلی سے جو بادشاہ کی تہذیب کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔ اس میں سے جاگیریں دی گئیں اس لئے بادشاہ کی آمدنی گھٹا دی۔

اس عہد کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ امراء ظاہری شان و شوکت پر بہت زیادہ توجہ دیتے تھے اس لئے امراء کو خوش کرتے تھے کہ اپنے سینے زیادہ سے زیادہ اور شاندار خطابات اختیار کریں مگر ان خطابات کو دیکھنے والے ان کے اوصاف سے حلی ہوتے تھے اس لئے بہت جلد ان خطابات کی اہمیت جاتی رہی اور یہ سب معنی ہو کر رہ گئے اور یہی حال منصوبہ کا ہوا کہ جن کی عزت و احترام ختم ہو گیا۔

جب امراء کی مملکتی حیثیت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی اور لوگوں میں ان کی عزت نہیں

رہی تو امراء نے لوگوں سے تعلقات ختم کر لئے اور اپنی حلیوں میں مگرش لگائیں جو مغلے اور نہ اس لئے باہر نہیں آتے تھے کہ ان کے پاس نہ تو ایسا ہاں رہا کہ جس کے پسنے کے یہ عادی تھے نہ سواری ہی اور نہ طارموں کی فوج جو ان کے ساتھ ساتھ چلا کرتی تھی۔ کیونکہ انہوں نے عاداتیں غنیمت کر کے سے کم تر بنا دیں اس لئے ان کی تہذیب کے ذرائع گھٹتے گھٹتے میں تک کہ غنیمت و مناسبت کے ہاتھوں نہ رہا حال ہو گئے اس کا ہنگامہ ان کے لئے موت ثابت ہوا کیونکہ اس کے بعد یہ معاشرہ سے غائب ہو کر عام لوگوں میں مل گئے۔

اسی قسم کی صورت حال سے پنج گنہ ہمارے حکمران طبقے اور امراء و پادشاہ ہیں کہ یہ بھی پاکستان کے ذرائع کو بونے میں بہی طرح سے مصروف ہیں اور ہر ایک کی یہ کوشش ہے کہ بدعنوانی کے ذریعہ جس قدر دولت انہیں کی جا سکے وہ کریں جائے اور اپنے مخالفوں کو مارشوب کے ذریعہ نقصان پہنچا جائے۔

دوسری طرف مغل امراء کی جماعتوں کی طرح اب ہر حکومت میں بدلتی کوشش کرتی ہے کہ ایم ایم ایس اور ایم پی اے کی حمایت حاصل کرنے کے لئے نہیں چلتا دینے چاہئیں بلکہ ان سے قرضے دوائے جائیں اور ہر قسم کی حمایت دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا کہ ملک میں خالی پانوں اور زمینوں پر تیزی سے قبضہ ہو رہا اور وقت آگیا ہے کہ جب یہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔ یہی حال قرضوں کا ہوا ہے کہ اس کی وجہ سے ملک کے ذرائع تلخ پے جا رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں کہ ہندوستان میں مغل بادشاہ و امراء کے ساتھ کیا ہوا؟ مگر سوال یہ ہے کہ تاریخ سے کوئی سبق سیکھے گا یا نہیں۔

سزائے موت

پندرہ سین (۱۸ صدی کا فرانس)

فرانس میں ہیری چارم پر قاتلانہ حملے کے جرم میں ایک شخص ڈبلیو کو سزائے موت سنائی گئی۔ جس دن اسے سزا ہوئی تھی سے ایک کھل گاڑی میں بٹھا کر شہر کے پورے چوک میں لایا گیا۔ جہاں سزا کے لئے ایک چوتھو ٹالا گیا تھا۔ سزا کو دیکھنے کے لئے پورا شہر جس اہم تھا۔ عورتیں بچے، مو، امیر و غریب، پھوٹے پڑے سب ہی جگہ تھے۔ قریب کی عمارتوں کی پھونکیں کھڑکیوں، دو دروازوں پر لوگ ہی لوگ جمع تھے۔ کچھ مردوں نے بچوں کو کندھوں پر اٹھا رکھا تھا تاکہ وہ مجرم اور سزا کو آسانی سے دیکھ سکیں۔

قیدی کو برسرِ حالت میں پھونکے پر لیا گیا اور اس کے ہاتھ پیر پائے کر اسے جت لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے جسم کو گرم سلاخوں سے دائے کا سلسلہ شریاع ہو، کونوں سے دھکی ہوئی سلاخیں جیسے جیسے اس کے جسم سے چٹکیں تھیں، قیدی کی پنجیں اُلت و تکلیف سے بلند ہو گئیں۔ تھوڑی دیر میں بے ہوش ہوئی گوشت کی بو تھا میں پھیل گئی۔ جب سزا پوری ہو گئی تو قیدی کے جامدوں ہاتھوں کو رسوں سے باندھ کر چوتھے سے نیچے کھڑی گھوڑ گاڑیوں سے باندھ دیا گیا اور گاڑی ہاتھوں نے گھوڑوں کو چالک دائے تاکہ گاڑیوں مختلف سمتوں میں جائیں اس طرح قیدی کے ہاتھ دھیر س کے جسم سے علیحدہ ہو جائیں۔ پہلی کوشش ہوئی مگر اس میں کامیابی نہیں ہو سکی اور قیدی کے ہاتھوں و رسوں نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ پھر کوشش ہوئی اس مرتبہ ایک گاڑی قید کا ہاتھ سے کر پھاگی اور مجمع نے اس کامیابی پر ہور دار تالیاں بجا دیں۔ جب دوسروں کو کامیابی نہیں ہوئی تو ایک جراح بلایا گیا تاکہ اپنے ہاتھ پیر کات کر سزا پر عمل کرایا جائے۔ جب جراحوں نے ہاتھ پیر کات ڈالے اور گھوڑے گاڑوں انہیں لے کر مختلف سمتوں میں پہلی گئیں تو قیدی نے سر اٹھا کر اپنے جسم کو دکھا اور اس کے ساتھ ہی خاموشی سے اس کا سر اٹھک کیا۔

دوسرا سین (۱۹ ویں صدی کا ہندوستان)

نظام تدارک مدد میں جس سے شاہ عالم جاتی کی آنکھیں نکلتیں تھیں، جب مرہٹوں کے ہاتھوں قید ہوا تو اسے شاہ عالم کے حکم پر سزائے موت سنائی گئی۔ پچیس دن اس کے کان

کٹ کر اس کی گردن میں ڈال دیے گئے اور اس کا چہرہ کالا کر کے سب شہر میں دکھایا گیا۔ دوسرے دن اس کی ناک کاٹی گئی اور اس حالت میں اس کی تشہیر کی گئی۔ تیسرے دن اس کی سیکھیں نکال گئیں اور اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر شہر میں بھرا دیا گیا۔ آخر میں اس کے ہاتھ کالے۔ اور پھر سزا اس کے بعد اس کے جسم کو ایک درخت سے لٹکا دیا گیا۔ اور اس کی آنکھیں، ناک اور ناک صندھ پتھوں میں رکھ کر شاہ عالم جالی کو بھیجے گئے۔

عہدِ وسطیٰ میں موت کی سزا کے پس منظر میں جو نظریات تھے وہ یہ کہ مجرم کو جسمانی اذیت ضرور دینی چاہئے تاکہ اس میں اور عام لوگوں میں فرق ہو سکے۔ اس لئے جسمانی اذیت کو اصفاف کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اذیت کے ذریعہ جسم پر جرم کو ثابت کیا جاتا تھا اس مقصد کے لئے ہاتھ، پیر، تپان اور کان کاٹنا، جسم کو پیسے سے باندھ کر اسے کھڑے کھڑے کرنا، ننگے جسم کو رانچا اور کوڑے مارنا، مرنے کے بعد جسم کو لٹکانا یا اسے جلا دینا عام طریقے تھے۔

بادشاہت کے زمانے میں مجرم کا جسم بادشاہ کی ملکیت تصور کیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ اس کا حق ہوتا تھا کہ وہ اسے سزا دے۔ غلامی اور جاگیرداروں کے زمانہ میں جسمانی اذیت اس لئے بھی دی جاتی تھی کہ ان اذیت کے پیروا دی نظام میں محنت اور جسم کی قدر نہیں تھی۔ جسم کی قدر صنعتی دور میں آئی۔ اور اس دور میں محنت معاشرہ کے لئے روزی تھوڑی۔ یہ بھی رستہ تھا کہ پچاسی سے پچیسے مجرم سے جرم کا احترام کر یہ جانے تاکہ اس طرح سے دی جانے والی سزا صحیح ہو جائے اور موت کے بعد کو درست تسلیم کر دیا جائے۔ پچاسی سے پچیسے مجرم سے کہ جاتا تھا کہ وہ خدا سے اپنے گناہوں کی سزا ملے گا اور جو پاک کرے۔

جیسے جیسے عوامی رپ لہند جاگیرداروں سے لگتا گیا۔ اور صنعتی دور میں داخل ہوتا گیا وہاں کے معاشرے میں جسمانی اذیت کم ہوتی چلی گئی۔ مثلاً پبلک سٹامپ پر پچاسی کا دواغ ختم ہوا اور اب سزا خاموشی سے جیل میں دی جانے لگی۔ ساتھ ہی میں یہ بھی سوچا گیا کہ مجرم کو اذیت دینے بغیر کس طرح سے موت کی سزا دی جائے۔ فرانسیسی انقلاب کے دوران گولین کی ریاست اسی سوچ کا نتیجہ ہے۔ بجلی کی کرسی اور زہر کے نکش بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

نیا میں سزا موت کی سزا کے خلاف ہو رہا تھا ہے وہ اس تجربہ کی بنا پر ہے کہ موت کی سزا سے معاشرہ تبدیل نہیں ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ ایک فرد ختم ہو جاتا ہے

مگر جرم کی وحدت باقی رہتی ہیں۔ اور جرم سے نفرت نہیں ہوتی۔

پاکستان میں سزائے موت کے بارے میں اب تک محدود و سبکی کے نظریات سنا دیے گئے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں قہاں اور جاگیردارانہ قدروں کی وجہ سے بدلتے اور انتقام سزائے موت کو جائز قرار دیتا ہے۔ دوسری جانب ہماری حکومت جرائم کو مٹانے کی بجائے مجرموں کو مٹانا چاہتی ہے۔ کیا سزائے موت کے ذریعے جرم کا خاتمہ ممکن ہے؟ تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ کیونکہ ایسا معاشرہ کہ جہاں ملکی مصالح نہ ہو، وہاں انتہائی سخت سزاؤں کے باوجود جرائم پلٹی رہیں گے۔ جرائم کے خاتمہ کے لئے ملکی اوصاف کی ضرورت ہے۔ ورنہ محض سزائے موت معاشرہ کو اور زیادہ برصورت و ارتداد کی جانب لے جاتی ہے۔

جرمن اور احساس جرم

دوسری جنگ عظیم میں شکست اور اس کی ذلت کے بعد جرمنوں کو جس انت سے گزرنا پڑا ہے وہ ان کا احساس جرم ہے۔ جنگ کے فوراً بعد نازیوں کے مظالم کے نتائج ان کے سامنے آئے، اس پر سختی ملکوں اور یہودیوں کا پورے انداز میں سب سے مل کر ان کی قوم کی تباہی ہو گئی۔ ڈالا اور وہ احساس جرم کے بوجھ کے برقی طہرج سے دھب کر رہے ہیں۔

چونکہ جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد جرمنی کے خلاف یورپی اقوام میں زبردست حسرت و حسرت پائے جاتے تھے۔ اسی لئے جرمن دانشمندان اور سیاست دانوں نے کئی بار اس کے خلاف اقدامات کیے۔ زیادتیوں کا اعتراف کیا کہ جو نازی دور حکومت میں ہوئی تھیں۔ اس میں مقررہ فیصلہ ہو گئی ہے۔ جرمنوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی کو فراموش نہیں کر سکتے۔ یہ دیکھ رہا ہے اسے اپنے دشمنوں سے نہیں نکالیں، بلکہ اپنے بعد سے انتہا میں سختی سے منتقل کریں۔ احساس جرم کے جذبات کا اعتبار مشورہ صاف اور انشیکل کے پڑنے سے ہے۔ ان الفاظ سے بھی ہونا ہے "میں اس کو ایک مقدس فرض سمجھتا ہوں کہ ہم ان تمام ذراقتوں اور دہشت ناک واقعات کو اپنے سامنے رکھیں کہ جن میں چھاپا ملے سے جرمنی اپنے ہم نپوں کے ساتھ ٹوٹا تھا۔"

جنگ کے فوراً بعد جرمنی کے مشہور فلسفی کارل یسپے نے ہانڈا برگ پورے دینی میں جرم کے سوال پر ایک پیچیدہ اور اس میں اس نے ان حوال کا تجویز کیا کہ جس کی وجہ سے ہٹلر اقتدار میں آگیا اور یہ کہ اس کے بددینی دور میں یورپی سرمایہ داروں نے جس کی حمایت کی، اس وقت سیاست دان بھی اس کے لئے بددینی اور اجرام کے جذبات رکھتے تھے۔ مثلاً ۱۹۳۸ء میں چرچل نے ہٹلر کے بارے میں ایک کلام لکھا جس میں ہٹلر کو مذہب کرتے ہوئے کہا کہ: اگر انگلستان پر بھی ایسی ہی چابی آئی ہوتی جیسے جرمنی میں آئی تو میں خدا سے دعا کرتا کہ وہ تمہارے جیسے عزم و حوصلہ کا محض ہمیں دکھائے۔ یسپے نے اپنے اس پیچیدہ دیکھ دی ہے کہ جنگ میں جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری چند افراد پر ہے اور اس کے لئے پوری قوم کو مجرم ٹھہرنا درست نہیں ہے۔

اس احساس جرم کی وجہ سے جرمنوں نے اپنے فوری دینی کو فراموش کرنا چاہا اور کوشش کی کہ اسے اپنی تاریخ سے نکل دیا جائے اس لئے جرمنی کے تعلیمی اداروں میں

تاریخ کو انیسویں صدی تک پڑھنا چاہئے گا۔ اور اس کے بعد کے واقعات کو نظم اندر ذکر دیا گیا۔

لیکن حساس جرم کے سلسلے میں اتحادی طاقتوں اور جرموں کے واقعات مختلف تھے۔ اتحادی جرموں کے، ماضی سے خوفزدہ تھے اور یہ ان کے مفاد میں تھا کہ وہ جرموں کو اخلاقی طور پر یاد کر سکیں اور اس کے لئے، انہوں نے نازی دور کو زندہ رکھنا چاہا تاکہ اس کے ذریعہ وہ جرموں کے جرائم کو کنٹرول کر سکیں۔ اس میں وہ بھی مدد تک کامیاب بھی رہے کیونکہ جرمنی نے مہارت کا رویہ اختیار کرتے ہوئے خود کا دفاع کیا۔ اور اپنے نفع خیز کو تسلیم کرنا اس میں باہم رہے۔ بلکہ جرمن دانشوروں اور سیاستدوں نے غلوں کے ساتھ تاریخ کے جرائم کو تسلیم کیا اور ان کی مذمت کی۔ اور کہا کہ ان جرائم کی شدت کو کم کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم ان جرائم کی خفیہ طور پر حمایت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی مخالفت کرنی چاہئے۔

خاص بات یہ ہے کہ روس کے سلسلے میں اتحادیوں کا رویہ جاپانیوں کے ساتھ بالکل دوسرا تھا اس کو جنگی جرائم کے سلسلے میں سوز الزام نہیں ٹھہرایا گیا اس لئے اس نے بہت جلد خود کو دوسری جنگ کے ماضی سے چھٹکارا دلایا۔ ایک گورنر دانشور ہو چکے سے جاپان اور جرمنی کا قتل کرتے ہوئے اس پر مدد دینی ڈال ہے کہ آخر کیوں جاپان کو جرائم سے بری کر دیا گیا۔ اس کا جیوں ہے کہ ناکازا کی دوا ہیروشیما پر ایٹم بموں کی جاتی نے جاپان کو ظالم سے مظلوم کا درجہ دیا اور وہ اس کی وجہ سے امن کا علم بردار بن کر دنیا کے سامنے آیا۔ اور ہیروشیما کی جذباتیت نے جاپانیوں کے جرائم کو چھپا دیا۔ لیکن ایک فرق اور بھی تھا جاپانیوں نے جس پر غم کئے تھے وہ عید قوم سے انہیں رکھتے تھے جس کی "سکور" ہے جبکہ جرمنوں کے مظالم یورپین اقوام اور یہودیوں پر ہوئے کہ انہوں نے اپنے خلاف ہونے والے مظالم کو خوب اچھا بھلا بیاں تک۔ بال ہار کا معصوم وقتہ امریکی تاریخ کا ایک اہم واقعہ بن گیا۔

ہوچر نے جاپان کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا ہے کہ جہاں تک لوگوں کے قتل عام کا تعلق ہے تو ہیروشیما اور ناکازا کی ایٹم بموں کی وجہ سے مریضوں سے زیادہ تعداد ان جرموں کی ہے جو بمباری کی صورت میں صرف شکار صرف اور۔ سنہ ۱۹۴۱ میں ۳۰ ہزار دوسرے کے لئے جاپان اور جرمنی کے سینے میں جو برقی دھماکا اس کے وہ مقاصد تھے: ایک تو یہ کہ اس طرح سے اتحادی چاہتے تھے کہ جرمنی دوبارہ سے فوجی طاقت نہیں بن چکے۔

امریکیوں اور اس کے حامی صیہیوں کا تھا کہ نازیوں کے مظالم کو بیاں کر کے اسرائیل کے قیام کا جواز پیش کیا جائے اور پھر اسرائیل میں فلسطینیوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں ان کی پردہ پوشی کی جائے۔ نازیوں کے ہاتھوں کا شکار ہونے کے بعد اسرائیلی خود کو مظالم بھگنے کے نور اب وہ فلسطینیوں کے ساتھ جس بربریت کا سلوک کر رہے ہیں وہ ان کی جگہ کی جگہ ہو جائے گی۔ فضا اس وقت اسرائیل کی یہ پالیسی ہے کہ وہ جس قدر تصحیبات کرتے ہیں اس قدر وہ نازیوں کے مظالم کو سامنے لاتے ہیں تاکہ ان

تک عظیم کے بعد جو واقعات ہوئے ان کی وجہ سے جرم کا سوا بالکل ایک حصہ ہی رہ گیا۔ جی بھی ہو کر کسی کے جرم کا مسئلہ اس لئے نہیں رہتا۔ جس میں نہ وہ دیکھا جائے بلکہ اس کا مقصد صرف جرمنی کی مذمت ہے۔ جبکہ میں طوط ہوئے نور انہوں نے دہشت نام کے خلاف کیا۔ تو اس نے اتحادیوں کی مخالفت پالیسی کو دہشت نام کے خلاف اس حقیقی جرم کی مذمت کرنے کے بجائے ان کی تین چار قرار دیا۔ دہشت نامی کے قاتل کو جس نے گاؤں کے معصوم لوگوں کا مرنے میں ایک ہزار یہودی بن کر انہماک جس کی تعریف میں گاہے گاہے

اس طرف اسرائیل کی مذمت کے تشدد اور بدعت نے جو اس نے فلسطینیوں کے لئے تمام اخلاقی قدروں کو بری طرح سے پامال کر دیا۔ اسرائیلی ریڈر باؤ کا اہتمام کر رہے ہیں کہ وہ فلسطینیوں کو قتل کر رکھیں گے۔ ۱۹۸۸ میں غزہ میں رہنے والے واضح الفاظ میں کہہ کہ "فلسطینیوں کو قتل کر دیا جائے گا انہیں مار دیا جائے گا ان کو ایسا بنا دیا جائے گا کہ وہ انسانی معاشرے کے قانون سے باہر رہیں اور وہ عرب دنیا کی سب سے زیادہ معصوم اور دیہات قوم بن جائیں" اور قہور حمرہ ہوا اگر شاہمر نے (۱۹۸۸) اعلان کیا کہ "اسرائیل کی ریاست تبدیل رہی ہے اس کی آبادی برابر چودہ رہی ہے" اس لئے ہمارے "وفاکار" اور پر غم یہودی اسرائیل کا ایک ٹکڑا بھی کسی کے حوالہ میں نہیں ہے۔ "سب سے زیادہ فلسطینیوں کے قتل عام کے نتیجے میں کسی بھی جرم کا احساس نہیں" بلکہ اس کا اطلاق جو ضرور ہے۔ اس لئے جب بھی ان کے جرم کے بارے میں توازن لگتی ہیں تو وہ نازیوں کے عہد کے ٹیپ اور یہودیوں پر مظالم کی داستانیں بیاں کر کے

لوگوں کو حاصوئی کر دیے ہیں۔

جرمنوں کا مسئلہ یہ ہے کہ نازیوں نے یہودیوں پر جو مظالم کئے تھے وہ اس کے بموجب تلے اس قدر وسیع ہوئے ہیں کہ ان میں قطعی یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ اسرائیلی جرم کے بارے میں بول سکیں۔ یہ کہ درحقیقت اسرائیلیوں کے مظالم نازیوں سے زیادہ بھانک اور اذیت ناک ہیں۔

پہلے ہوئے حالات کے تحت اب جرمنی کے مورخوں میں یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ کس طرح سے جرم کے احساس سے نہایت پائی جانے اور اپنے نازی دور کو کس طرح سے تاریخ کا حصہ بنایا جائے۔ چنانچہ جرمنی کے مختلف مورخوں نے نازی جرم کو کئی نقطہ نظر سے لکھا ہے۔

رجنٹ پندر مورخوں نے نازی ازم کی تحریک کو اسی طرح سے بیان کیا ہے کہ یہ جرمنی میں صنعتی ترقی کی وجہ سے ہوا۔ اس میں متوسط طبقہ کو جاگیردارانہ مراعات دیدی گئیں جب کہ پندرہری طبقہ کو بالکل محروم کر دیا گیا۔ صحران مطبق سے چلے متوسط طبقہ کے لوگوں کو جمہوری تحریکوں کے خلاف استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیضی سوشل ازم کو مقبولیت مل گئی۔ دیکھا جائے تو جرمن معاشرہ میں نازی ازم کی کوئی جڑیں نہیں تھیں یہ اس لئے پہلا کہ اسے بطور جیسا راہنما مل گیا اور پھر نے سٹالن کی پیروی کی اس لئے اب جرمنی کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوبارہ سے عیسائی اخلاقیات اور پرورش کی خوبیوں کو وہیں لائے۔

بہل مورخوں نے پروشیا کے فوجی ورثہ کی خدمت کی کہ جس کی وجہ سے جرمن معاشرہ میں آمریت پران چرچی دور یہ دیکل دی کہ جمہوری روایات اور معاشرہ میں ملتی آرازی وہ راستے ہیں کہ جو نازی ازم اور فاشیزم کی راہوں کو روک سکتے ہیں۔

۱۹۸۸ء میں ایک کانفرنس میں جس موضوع پر مورخوں نے مقالات پڑھے اس کا عنوان تھا کہ "جرمن تاریخ کس کی ہے؟" اس کانفرنس میں اس پر بحث کی گئی کہ جرمن معاشرہ میں تمام تبدیلیوں کے باعث نازی ازم کے سامنے اس پر پرے سے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اپنے اہم مسائل پر پوری توجہ نہیں دے رہے اور ان کے "گمے بڑھنے میں دیکھو پڑا ہو رہا ہے۔ اس لئے وہ وقت "گیا ہے کہ نازی دور کے اخلاقی کو دوبارہ سے دیکھا جائے اور اس کی تعمیر کی جائے اور نہ تو لے جو کہ ایک قدم پندرہری سے اس نے نازی ازم کے بارے میں اپنی تحقیقات میں ہوا فراہم کیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نازی ازم

کیونٹرم کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ پھر نے سٹالن کی پیروی کرتے ہوئے کمپ قائم کئے اور اس میں لوگوں سے بیچار کام کیا۔ اس کا نسل قتل عام کیوسٹوں کی جھٹائی قتل عام کے فوج تھا۔ دونوں سے صنعتی ترقی کے نتیجہ میں ہونے والے مسائل کا حل یہ نکلا کہ لوگوں کے یہ طبقہ کو ختم کر دیا جائے۔ نازیوں نے یارپ کو کیونٹرم سے بچاؤ اور اس کے دفاع میں نہیں کسی ایک نظریہ کی ضرورت تھی جو انہیں یہودیوں کی مخالفت میں ملے۔ نازیوں کا یہودیوں کے مسئلہ میں قائل سولوش (Final Solution) کیوسٹوں کے گارگ کے مترادف تھا۔ نازیوں اور کیوسٹوں کے سرے ایک جیسے تھے۔ دونوں نے یہودیوں پر بھروسہ کیا اور پورے طبقہ کو اپنا دشمن سمجھا۔ دیکھا جائے تو پندرہریوں کے خلاف اس وقت ہوا جب ۱۹۳۹ء میں دانٹسین نے یہ عدل کر دیا کہ دیا پھر کے یہودی جرمنی کے خلاف برطانیہ کا ساتھ دیں گے۔ قتل عام کے واقعات وہاں کی تاریخ میں دکھائے ہوئے ہیں۔ اور اس لئے ان میں کوئی توجہ کی بات نہیں ہے۔ یہ ان ہوئے واقعات نہیں تھے۔ اس کی بل ہے۔ یہی کی تاریخ اس لئے منع ہوئی ہے کیونکہ اس کو قاتلین کے نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے۔

ایک دوسرے جرمن مورخ نے اسے اس جانب اشارہ کیا کہ نازی مظالم کو یہاں کرتے ہوئے "آریوں" کے یہ مظالم نہیں ہیں۔ یہاں کہ "آریوں" نے جنگ کے بعد "آریوں" کے یہ "جس میں قتل عام" کو قبول سمجھتے ہیں اور "آریوں" کو دوسری "جس" نہیں "آریوں" جس تک "جرمن فوج" کا قتل عام سے "دوسرے جرمن روایات کے مطابق لڑی۔ جب الوطنی اور احساس فوج اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے اور اس کی شہادت برطانوی مورخ لڈن وارٹ نے بھی دی ہے کہ جرمن فوج نے جنگی قوانین کی پابندی ۱۹۳۹ء کی جنگ کے مقابلہ میں رو دیا کی۔ جب جنگ ہو رہی تھی کہ گارپ جرمن فوج کو اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا کہ یہودیوں کا قتل عام ہوا ہے کیونکہ یہ تعلیمات تو جنگ کے بعد ہی ہر ہوئیں۔ اس لئے یہ دلیل دی ہے کہ یہودیوں کے قتل عام کی ذمہ داری پھر ہے کیونکہ جرمن عوام اس سے قطعاً بے خبر تھے۔

ماتنگ اسٹور نے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ احساس جرم کس طرح سے جرمن قوم کی شناخت میں رکاوٹ بن گیا ہے اس لئے اس کا کہنا ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ جب جرمن تاریخ کو کوئی مفہوم دیا جائے کہ جس کی بنیاد پر جرمن لوگ قومیت کو پیدا کر سکیں۔ اس لئے یہ دلیل دی ہے کہ جرمن لوگ اس طرح سے ہیں کہ ان کا ماضی

سلسلہ میں حساس جرم میں جکلا رکھے۔ اس کی دہلی سے مددیں و انگریز صورت اس نے
انعام ہوئی کہ وہ درستی کے سلسلہ کے تحت جس جرم کے پوجہ میں جکلا تھی اسے بدست
نہیں کر سکی۔ لہذا کوشش کرنی چاہئے کہ تاریخ خود کو نہیں دہرائے۔

لیکن یہ بھی درست ہے کہ جرم لوگ جس احساس جرم میں جکلا ہیں اس کے ہنگام
ثبوت اثرات بھی ہیں۔ انہیں جب جنگ کے نتیجہ میں ہونے والے مظالم اور تباہیوں کا
حساس ہو تو اس سے انہیں امن کی طرف راغب کیا اور جرم میں معاف شدہ یا وہ سے بدست
امن پسند ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ جرم لوگ جنگ کی درست کرتے ہیں اسلحہ کی تخفیف کے
حالی ہیں اور انسانی حقوق کے نئے جدوجہد کرتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے فاشزم اور "سرمہ
حکومتوں کو دیکھا ہے اس لئے اب وہ دنیا بھر میں مسوری تحریکوں کی حمایت کرتے ہیں۔

اگر حساس جرم کے یہ ثبوت اثرات ہوتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ اسے صرف جرمی
تک کیوں محدود رکھا جائے؟ انکو کیوں نہ اعلیٰ برطانیہ، فرانس، امریکا، جاپان اور اسرائیل
تک پھیلایا جائے؟

نازی دور: تجربہ سے سیکھنا

دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور یہ دونوں ریاستیں
ظہیرہ "سیاسی" سماجی اور معاشی تجربات سے گزریں کہ جس کی وجہ سے ان دونوں کی
رہنمائی میں مدد ملے۔ پہلی جنگ عظیم کے بارے میں صورت پیدا ہوئے تو مشرق
یورپی نے سورجوں سے روشنی دہائی خطہ نظر و اختیار کرنے اور کی تشریح
کی طور اس قصوری کو بظاہر دیکھا کہ جسے ۱۹۳۰ء میں کو مصیبت نے اختیار کیا تھا۔ اس طریقے کے
تحت "جنگ" سرمایہ داری نظام کنڈوری کے مرحلہ میں ہوتا ہے تو اس وقت "جنگ" پسند
قوموں کے ساتھ مل کر مزدوروں کے ساتھ اٹھو کر لیا ہے اور جب لوطی کا سولہ کر
انتخاب کے عمل کو مدد کرتا ہے اس کے ساتھ ہی انہوں نے نازی دور پر تنقید کی اور خود کو
اس سے باہل ظہیرہ کر لیا۔ کیونکہ کیونست ہونے کے ناطے وہ نازی پارٹی کے ابتدا سے
جڑے تھے۔ اس کے نتیجہ میں انہوں نے نقصانات بھی اٹھائے تھے۔

اس لئے نازی دور کی ساری ذمہ داری مغربی جرمنی کے لوگوں پر آئی اور اس کے
مورخوں کا یہ حکم تھا کہ وہ اس حد کی تشریح کریں جو ان پر جو جرائم کا بوجھ ہے اس
کسی طرح کم کریں۔ ان مورخوں نے نہ صرف اس کی تفسیر کر لیا بلکہ اس کے
علاقہ دوسرے غیر مارکسی تاریخی نظریات کو بھی استعمال کرتے ہوئے اس دور کی تعبیر کی۔
اس میں سے ایک "مردہ عوامی تاریخ" ہے کہ جس میں لوگوں سے انٹرویو لے کر نازی دور
کے بارے میں لوگوں کے تاثرات کو قلم بند کیا گیا۔ اس میں سے ایک اہم کوشش یہ تھی
کہ نازی دور کو پہلے تاریخ کا ایک حصہ بتایا جائے اور پھر اس کے بعد اس کا تجربہ کیا
جائے۔

جرمن مورخوں کے لئے ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ جب بھی نازی دور پر لکھتے ہیں پورا
یورپ اور امریکا ان کی تحریروں کی جانب توجہ دیتا ہے۔ خاص طور سے اسرائیل کہ جس
سب کو یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ اس دور کا ثبوت تجربہ کر کے کس جرمن قوم خود کو
حساس جرم سے آزاد کرے۔

مثلاً جب جرمن مورخوں نے نازی دور کو جرمن تاریخ کا ایک حصہ بتایا تو اس پر
اسرائیلی مورخوں نے سخت تنقید کی کیونکہ ان کے نزدیک یہ دور اصل تاریخی دور نہیں تھا
بلکہ ایک ایسا دور تھا جو نازل حدود سے بڑھا ہوا تھا۔ اس موقع پر وہ سورج بھی کہ جن کا

یہ کہتا ہے کہ تاریخی واقعات پر کوئی لیصلہ نہیں دنا چاہئے اس کا اصرار تھا کہ نازی دور کی اخلاقی طور پر اہمیت کو نظر انداز کرنا چاہئے۔

ان حالات میں جرمن مورخوں کا کام مشکل ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے جن مختلف نقطہ نظر سے مارے دار کو دیکھا ہے۔ وہ اس دور کو دیکھنے کے لئے اہم ہے۔ پس سوال تو اس مسئلہ میں یہ کیا کہ نازی دور کو کیا کہا جائے؟ کیا یہ جرمن تاریخ میں ایک حلقہ تھا یا تاریخی عمل کی پیداوار؟ یورپی اور امریکی مورخوں کا کہنا تھا کہ یہ جرمن تاریخ کے سیاسی و سماجی عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے کیونکہ جس جوش و خروش کے ساتھ جرمن قوم نے نازی پارٹی اور اس کے نظریہ کو اختیار کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں نسلی برتری اور دلا پر حکومت کرنے کے جراثیم موجود تھے۔

اس کے برعکس جرمن مورخوں نے سے تاریخ میں ایک حلقہ قرار دیا۔ انہوں نے ۱۹۱۸ء کی دہائی میں اس موضوع پر لکھنے ہوئے کہا کہ جرمن تاریخ کا صحت مند تاریخی عمل پہلی جنگ عظیم کے وقت لوٹ گیا جب کہ جرمن حکمران طبقوں نے اپنے سامراجی مقاصد کے لئے لوگوں کے ہندوستان پرستانے بعد میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تاریخوں نے لوگوں کے ہندوستان سے فائدہ اٹھا لیا اور مقبوضہ حاصل کی اس نقطہ نظر سے جرمن مورخوں کو وہ اصول میں تقسیم کر دیا اور یہ فشر کے نظریہ کے حامی و مخالف کہلائے۔

کچھ مورخوں نے اس سے بھی اختلاف کیا کہ نازی دور کو فاشزم کہا جائے کیونکہ ان کے نقطہ نظر کے مطابق فاشزم اٹلی کی پیداوار تھا اور یہ جرمن تجربہ سے بالکل مختلف تھا اس کے برعکس نازی ریم نسل برتری کا حامی تھا اور ریاست و لوگوں پر اس کو پورا پورا قابو تھا۔ اس کے علاوہ اس کے عزائم میں یہ شامل تھا کہ دنیا کو فتح کیا جائے اور اسے نسل پرستانہ و تکلیف دہ بنایا جائے۔

جب کہ اٹلی میں فاشزم کے حامی طبقہ اعلیٰ کے لوگ تھے اور ان کا ریاست پر لاگوں پر لڑا کشتیوں میں تھا اس لئے نازی ازم اور فاشزم کو ایک سمجھا جاتا ہے۔ نازی ازم ملحد و تھیوری تھی جس میں ہٹلر کی حراکتیز قیادت میں جرمنی کو شاندار و پر عظمت ملک میں تبدیل کرنے کا منصوبہ تھا۔

کچھ ہیں، سرعزیمات جس میں شوم یڈم اور رالف ڈارن لورڈ شامل ہیں، نازی ازم کو ایک ایسا عنصر قرار دیتے ہیں کہ جس نے جرمنی میں سماجی انقلاب کے عمل کو تیز کر دیا۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق جب نازی قیادت میں آئے تو وہ معاشرے کے سماجی زعمیہ میں

جڑی تہذیبوں کے کر سکتے اس عمل میں انہوں نے بہت سے قدامت پرست اور فرسوں اداوں اور روایات کو تبدیل کر دیا کہ جو ان نئے کے خطرناک تھیں، لیکن اس کی وجہ سے آگے چل کر تہذیبوں کے نئے راہیں ہموار ہو گئیں۔ نازیوں کی ناکامی کے بعد مطلق انسانیت کا وہ اوصاف جو ہمارے کے فائدہ جرمن معاشرہ کو اپنے اپنی تہذیب میں بکڑے ہوئے تھا نوٹ کیا اور اس کے نتیجہ میں میں جیسویٹ کو بھٹنے پھوٹنے اور آگے بڑھنے کے مواقع مل گئے۔

دور مہا کی تاریخ سے جرمن معاشرہ کے پارے میں جو تاثر ملتا ہے وہ یہ کہ اگرچہ نازی دور میں برصغیر اور علم پیچیدہ ہوا نظر آتا ہے مگر اس کے پیچھے عام لوگوں کی زندگی نارمل اور بہت سی سادگی تھی۔

فاضل کے بارے میں حقیقی و تحقیقی کرنا اس سے سبق سیکھنا ہے زندہ اور باعمل قوسوں کا کام ہے تاکہ فاضل میں جو کچھ خطا ہوا اس تجربہ کی بنیاد پر یہ کوشش کرنی چاہئے کہ ایسا دور نہ ہو۔

قوم اور قوم پرستی

قوم اور قوم پرستی نہ صرف یورپ میں بلکہ ایشیا و افریقہ کے بڑے آزاد ہونے والے ملکوں میں بڑی اہمیت کا حامل مسئلہ ہے۔ یورپ میں قوم پرستی اور قومی ریاستوں کا فروغ کی مراحل میں ہوا مگر خاص طور سے فرانسیسی انقلاب کے بعد قوموں کی تشکیل اور قومی علامات بننے کا عمل تیز تر ہو گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب ایشیا و افریقہ میں نوآبادی نظام کے خلاف قومی تحریکیں شروع ہو گئیں تو ان ملکوں میں بھی قوم پرستی کے جذبات ابھرا شروع ہوئے اور آزادی کے بعد خاص طور سے ان ملکوں میں یہ مسائل سامنے آئے کہ قوم کی تشکیل کن بنیادوں پر کی جائے۔ اور کس طرح سے مختلف نسلی و ذاتی جماعتوں کو جو مذہبی و لسانی طور پر علیحدہ علیحدہ ہیں انہیں ایک کیا جائے۔ کچھ نئی صورت حال سے پاکستان بھی دوچار ہے کہ یہاں بھی پاکستان قوم کی قیود تشکیل اب تک نہیں ہو پائی۔ ان تمام سوالات کا حل تاریخ کے اس عمل میں ہے کہ جس سے قوم پرستی اور قوم گدردی ہے اور اس سوال کو حل کرنے کے لئے اسی ہے ہانس ہام کی کتاب "قومیں اور قوم پرستی" (1974ء) سے "نئی اہم ہے کیونکہ یہ کتاب بہت سے تاریخی مضامین کو ضم کرتی ہے اور قوم پرستی کی تشکیل میں کون سے عوامل کام کر رہے تھے ان کو دیکھنے سے لگتی ہے۔

قوم کی تشکیل کے بارے میں جو بھی نظریات ابھر کر آئے ان کی ابتداء یورپ سے ہوئی اس لئے ان نظریات کے سامنے جو ماضی تھے وہ یورپ کے ملکوں اور ان کی تاریخ کے تھے۔ ان میں زبان، نسل، جغرافیائی حدود سے لے کر وہ تمام سماجی نظریات بھی تھے کہ جو اس وقت نوآبادی ملکوں کے مفادات کو پورا کر رہے تھے مثلاً فرانس کے مفکر رنل نے کے نزدیک جو شخص جہاں بھی رہتا ہے وہ اس ملک یا اس علاقہ کا باشندہ اور شہری ہے۔ اس لئے اس کی قومیت بھی اس کی رہائش سے متعین ہوگی۔

یورپ میں قوم پرستی کے فروغ میں جن عوامل نے حصہ لیا ان میں جنگوں، ان کے نتیجہ میں ہونے والی نقصان و تباہی، ذرائع آمد و رفت کی سہولتوں، اور تعلیم کے پھیلاؤ نے اہم حصہ لیا ہے۔ ہانس ہام نے مشرقی یورپ کے ایک معتمد ہروٹش (Hroch) کے اس دلائل کو پیش کیا ہے کہ جو اس نے یورپ کی تاریخ کو مد نظر رکھتے ہوئے بنایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ معاشرہ میں قومی شعور کا ارتقاء غیر سادی طور پر ہوا ہے اور اس

میں کچھ علاقہ اور جماعتیں زیادہ باشعور ہو جاتی ہیں۔ اور کچھ آہستہ مددی کے ساتھ ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ قومی شعور حاصل کرنے والوں میں عوام کہ جن میں کسان، مزدور، اور ملازم شامل ہوتے ہیں۔ یہ سب سے "خوش" تھے ہیں۔ مثلاً یورپ میں انیسویں صدی میں جو قومی شعور ابھرا شروع ہوا اس کے تین مرحلے تھے۔ اولیٰ خاص "اٹلی" اور "لوک ریپ" پر مبنی اس میں کوئی قومی یا سیاسی علامات شامل نہیں تھے دوسرے مرحلہ میں سیاست داخل ہوتی ہے اور یہ نئے قوم پرست رجحان میں آتے ہیں۔ اور تیسرے دور میں جا کر عوام کی حمایت حاصل کی جاتی ہے۔

ہانس ہام نے ان عناصر کی نشاندہی کی ہے کہ جنہوں نے قوم کی تعمیر اور تشکیل میں مدد دی۔ مثلاً جرمنی اور فرانسیسیوں نے زبان کی بنیاد پر قومی نظریے کو فروغ دیا۔ اور بنیادی طور پر اس حصہ کو صحیح تسلیم کیا کہ اگر قومی نظریے کی بنیاد پر مختلف جماعتیں متحد ہوتی ہیں تو یہ جائز ہے لیکن اگر یہ متحد کرنے کے بجائے انہیں تقسیم کرتا ہے تو اس صورت میں یہ ناجائز ہے۔ اس سے قومی تحریکوں کا مقصد اتحاد ہونا چاہیے۔ اس سے انیسویں صدی میں قومی تحریک کا مقصد تھا کہ کئی زبانوں "لسلوں" اور قومیتوں کو یکجا کیا جائے کیونکہ ملتوں کے بنیادی اصولی قومی اکر پوری قومیتوں میں ضم ہو جائیں گی تو وہ اسی صورت میں متحدہ حاصل کر سکیں گی۔ یہی بات جرمن معتمد لٹ (Litt) نے بھی کہی کہ جس قوم میں زیادہ آبادی ہو اور جو وسیع ذرائع کی مالک ہو تو وہ جلدی ترقی کرے گی لیکن جس قوم کی آبادی کم ہوگی اور جس کا علاقہ محدود ہو گا اور اس کی پیچیدہ سے زبان ہوگی تو ایک ایسی قوم بنے گی۔ محدود اور منطوق ضم کے "دب" رت اور آبادی کو پیدا کرے گی۔

اس لئے انیسویں صدی کے یورپ میں قوم پرستی کو یہی مقصد کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا کہ اس کے ادب سے کئی زبانیں بولنے والوں "نسل" مذہبی اور مختلف قومیتوں کو یکجا کر کے ان کا ایک قوم بنایا جائے۔

کسی ایک قوم کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس پر مدعی ڈیتے ہوئے ہانس ہام نے اس نے تین پسوؤں کی مثال دی کی ہے اور "کسی ریاست کے ساتھ تاریخی وابستگی" یہ دو سنگ طویل بھی ہو سکتی ہے اور کم عرصہ کی بھی "روم ایک عالم یافتہ اور شعلی طبقہ کی موجودگی" اور تحریری ادب کا ہونا۔ سوم اس میں اس ہیئت کا ہونا کہ وہ مختلف جماعتوں کو جمع کر سکے۔

قوموں کی تشکیل میں ایک بڑا عنصر زبان کا رہا ہے۔ اس بارے میں ہانس ہام کے کہنا

ہے کہ جس زبانوں پر قومیت کی تعمیر ہوتی ہے وہ ملتی اور مصوبی ہوتی ہیں۔ یہ کہہ ہوتا ہے کہ جو زبان بولی جاتی ہے اس کے گھر میں سے کسی ایک کو جن یا سات و سہ سے ثقافت اور معاشرہ کے رہن کو بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ زبان ہندسہ سحر، طقوس اور تقسیم یافتہ طبقے کے مفاد کو فروغ دیتی ہے۔ وہ زبان کو معیاری بناتے ہیں۔ اور اس طرح عوام اور خواص میں فرق کو قائم رکھتے ہیں۔ چنانچہ ۱۷۸۸ء میں فرانسیسی بچپاس فیصلہ آبادی فرانسیسی نہیں ہوتی تھی اور جب اٹلی کا اتحاد ہو ہے تو اس وقت اٹلیان فیصلہ لوگ اطالوی زبان کو دور مو کے استعمال کے لئے بولتے تھے۔ اور ستم خیزان یہ تھی کہ یہ جموں سے اقلیت خود کو "اطالوی عوام" کہتی تھی۔

اس لئے زبان کی بنیاد پر قوم پرستی میں وہ زبان استعمال ہوتی تھی کہ جو انتظامی امور اور سرکاری کارروائی میں کام آتی تھی۔ وہ زبان کے بارے میں لوگوں میں شعور اس وقت بڑھا کہ جب صوم شہری میں ان سے ان کی اور زبان کے بارے میں سوالات کئے گئے۔ اس نے ان میں لسانی قوم پرستی کو پیدا کیا۔

۱۸۸۸ء سے لے کر ۱۹۱۴ء کے درمیان جو تبدیلیاں آئیں۔ اس کے نتیجہ میں ہر قوم کو حق خود اختیاری دیا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہر قوم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا عقیدہ سے ملک و ریاست بنائے "قوم کی تکلیف کے" بنیادی فہم لسانی و سیاسی صورت قرار پانے پر قومی ریاست بنانے کے لئے جرمنوں اور اطالیوں نے جدوجہد کی کہ جس کی بنیاد زبان تھی۔ اس کے علاوہ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ کی سیاسی صورت حال بڑی تیزی سے تبدیل ہوئی، سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ جمہوری عمل تیزی سے پھیلنا جس کی وجہ سے جمہوری اداروں میں لوگوں کی شمولیت بڑھ گئی، لوگوں کی سموریت ایک دوسرے کے ملک میں تیز ہونے لگی، ساتھ ہی میں مختلف وجوہات کی بنا پر لوگ ایک ملک سے ہجرت کر کے دوسرے ملک میں جانے لگے، اس نے مقامی ثقافتی تضادات کو توڑ ڈالا، "مادری زبان کا جو تصور اب تک پورا اہم اور قومی شناخت سے منسلک تھا وہ ختم ہو گیا، لوگ وہ دہائیں سیکھنے لگے کہ جن سے ان کے مادری مفادات وابستہ تھے، وہ لوگ کہ جو ایک زبان بولنے پر صبر کر سکتے تھے ثقافتی طور پر پس ماندہ ہو گئے۔ یورپ کے جموں کے جموں کوں میں جیسے کہ "بیم" ہالینڈ اور سکیڈی کی بھئی ممالک جس وہ مادری زبان کے ساتھ دوسری بین الاقوامی زبانیں سیکھتے ہیں کہ جس کی وجہ سے ان کا واحد وسیع ثقافت سے ہو جاتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں وہ ایسی بڑی سطحیں ختم ہو گئیں کہ جو بین الاقوامی تھیں،

یعنی ہسبرگ (Hapsburg) اور عثمانیہ اور ان کے فوجیوں سے جو ریاستیں وجود میں آئیں وہ قومی تھیں۔ یہ سارا میں جموں تھیں۔ اور ان میں سے اکثر نے یہ کوشش کی کہ ایک قوم کی تشکیل کے لئے ایسے گروہوں کو کہ جن کا ان سے تعلق نہیں تھا جس باہر نکال دیا جائے۔ چنانچہ ترکی نے آرمینیوں اور یونانیوں کو نکال دیا، تو پولینڈ اور نیچے سلواکیہ نے جرمنوں کو نکال دیا۔ وٹش روسی نے ایسے ممالک کو کہ جو سماج میں رکاوٹ ہیں انہیں بالکل ختم ہی کر دیا جائے۔

قومی ریاستوں کے حکام میں ایک اور اہم عنصر روسی انقلاب کا تھا۔ اور اتحادیوں سے اس انقلاب کو روکنے کی خاطر امریکہ کے صدر ولسن کے اصول کا سہارا لیا کہ جس میں ہر قوم کو خود مختاری کا حق دیا گیا تھا۔ اور یورپ کی ریاستوں کو قومیت کی بنیادوں پر مضبوط کیا گیا تاکہ روسی انقلاب کی بین الاقوامیت کو روکا جائے اور اسی کے نتیجہ میں جرمنی اور اٹلی میں پر عہدہ قسم کی قوم پرستی بھڑکی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایٹیاہ و امریکہ میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ "اعلایات" اور عالمی طاقتوں کی داخلی بیماری کی وجہ سے نئی قومی ریاستیں وجود میں آئیں۔ مگر ان کی خصوصیت پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ریاستوں سے جدا تھی۔ کیونکہ ان کی سرحدیں "اور قوموں کی تقسیم نوآبادیاتی نظام نے اپنی مرضی سے کی تھی جس کے نتیجہ میں قومیں لسانی، نسلی اور سماجی طور پر تقسیم تھیں۔ اور اس لئے ان ریاستوں میں ایک قوم کی تشکیل مشکل ہوئی۔

فاشزم

فاشزم کی اصطلاح اب ہمارے معاشرے میں بہت عام ہو گئی ہے اور یہ ہر اس عمل کے لئے استعمال کی جاتی ہے کہ جو انفرادی آزادی یا اجتماعی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے چارے اور ہوا بدعت ہو یا گورنمنٹ اگر وہ معاشرے میں کسی ایک شخص یا اشخاص کو حاکم اور قوت کے ساتھ نافذ کرے تو یہ فاشزم کے درجہ میں ہے۔ فاشزم کی تعریف کرتے ہوئے دانشور کہتے ہیں کہ فاشزم کی تعریف کرتے ہوئے اس اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے ضروری ہے کہ یہ تحریک جن سماجی حالات میں پیدا ہوئی ہے انہیں دیکھنا اور ان کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ اس کو کسی قوم کے قومی کردار یا نسبت سے منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ فاشزم ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوتا ہے جہاں فرد کی آزادی کو ترقی کرنے اور اسے پیچھے کے موقع میں نہیں آتے ہیں۔

فاشزم بنیادی طور پر ایک درجہ بندی میں ہوئی اور اسے حالات میں ہوئی کہ جب ان دلوں ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیاں نہ صرف مقبول تھیں بلکہ سرگرم بھی تھیں مگر بیسویں صدی کے عروج میں تو اس سے ان ملکوں میں مبینہ پارٹیز و سخت نقصان پہنچا کیونکہ فاشزم کی تحریک میں اتنی وسعت تھی کہ اس میں نہ صرف سرمایہ ور شامل ہوئے بلکہ پروکاری طبقہ بھی بڑے ہوش و خروش سے اس کا ایک حصہ بن گیا۔ اس لئے کمیونسٹوں نے جب فاشزم کا تجزیہ کیا اور اس سوال کو اٹھایا کہ "تو کیا یہ ضروری ہے کہ فاشزم کے خلاف اس میں جوڑی جائے۔" اس کے برعکس سماجی مرنہ علوم سے فاشزم کے خطرات کے مطالعہ کے بعد اس کا اظہار کیا کہ فاشزم کی بنیادیں جن نظریات پر استوار ہوتی ہیں ان میں جمہوریت کی مخالفت اور مزدوروں کی متحدہ جماعت سے انکار ہوتا ہے۔ یہ غلطی ہم کو اس طرح سے سر کرتے ہیں کہ عوام ان سے متاثر ہو کر ان میں شامل بھی ہوں مگر ساتھ ساتھ معاشرہ کا جو سماجی "سیاسی" اور معاشرتی ڈھانچہ ہے وہ بھی تبدیل نہ ہو اس لئے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ طبقاتی تضادات کو دور کر کے یا کم کر کے پارٹی کے مفادات کے ذریعہ سب کو آپس میں ملا دیا جائے اور لوگوں کے دامن میں یہ بھیا جائے کہ معاشرہ کے دشمن کے لئے کسی طاقت کا ہونا ضروری ہے وہ طاقت چاہے ایک باپ کی طاقت ان میں ہو یا حکومت میں رہنما کی

ہو۔ اکثر معاشرہ کی تمام خرابیوں کی ذمہ داری یہ اگلیتیں پر ڈالتے ہیں اور لوگوں کی بے چینی اور دباؤ کو کم کرنے کے لئے نہیں اپنا چکار بناتے ہیں۔

فاشزم میں تین عناصر انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں ایک اس کا پر تشدد قوم پرست ہونا اور قوم پرستی کی بنیاد پر عوام کو پارٹی میں شامل کرنے سے متعلق ہٹا ہٹا چارہ دہی کی قیادت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہونا کہ جو لوگوں کو اپنی نظریہ کے ذریعہ بھڑکاتا ہے اور نتیجہ یہ ہو کہ لوگ اس پر اعتماد کر کے لگیں اور ساتھ ہی میں کسی ایک شخص کا ہونا

قرن بیسویں جو ایک سماجی علوم کا دور ہے اس کا کہنا ہے کہ فاشزم پہلی بار ہوا معاشرہ میں پیدا ہوتا ہے اور یہ جمہوریت مخالف جماعتوں کو ختم کر کے معاشرہ میں استحکام کو پیدا کرتا ہے اور معاشرتی مسائل کو اس طرح سے حل کیا جاتا ہے کہ ملک میں جبر و تشدد کے ذریعہ مسئلہ حل کرنے کے بارے میں لگائے جاتے ہیں اور ان کے ذریعہ لوگوں کو ملازمت فراہم کی جاتی ہے اور اسٹوٹ لوتے ہو کہ فاشزم کے دور میں اس سے ایک ہے اس لئے فاشزم کی مختلف راہوں سے تعریف کی ہے۔ مثلاً بیسویں کے نزدیک فاشزم اس لئے پیدا ہوا کہ یورپی معاشرہ بیکور ہو گیا اور اس میں مذہب کی حیثیت کمزور ہو گئی اس لئے اس کا متبادل اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ جب معاشرہ کو ترقی دیا جائے۔ قدامت پرستوں کے لئے فاشزم کے ذریعہ عوام میں اور مدیہ خیالات و نظریات کے خلاف بغارت کرتے ہیں اس لئے انہی کی طرف والہی اس معاشرہ میں استحکام پیدا کر سکتی ہے۔

لوتے نے اپنے مطالعہ میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ماضی میں فاشزم اس لئے بڑا پکڑ سکا اور مقبول ہو کیونکہ پہلی ازم اپنے مقاصد میں ناکام ہو گیا۔ بنیادی طور پر فاشزم اور کسی نظریہ کے خلاف ہوتا ہے اور یہ اسے اسی کے حریفوں کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

ان کے مقابلہ میں کچھ نے فاشزم کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنی اور جرمنی میں ان کے عروج کا تجزیہ کیا ہے اس کے نظریہ کے مطابق اپنی میں سرمایہ و مہم کا یہ معیار ہے کہ مزدوروں کو کم سے کم تنخواہیں ملنی چاہئیں اور اس لئے وہ ان مزدور یونین کا خاتمہ چاہتے تھے کہ جو متحد ہو کر کام کر رہی تھیں ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ حکومت معاشرتی برائیاں میں ان کی مدد کرے اور ان کی شہاد کو شکستوں سے بھارت دے دے۔

جرمنی میں بھی سرمایہ دار جمہوریت کے خلاف تھے اور ساتھ ہی میں مزدور جماعتوں

سے حرف وہ تھے اس لئے ان دونوں ملکوں میں سرمایہ و دولت نے فاشزم کی حمایت کی تاکہ جمہوریت قدروں اور روایت کو ختم کر کے اور مزدوروں کے اتحاد کو توڑ کر وہ ان کا اختصار کر سکیں

لیکن سہ فاشزم کی جس بنیادی خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ اس طرح سے ہیں:

- ۱۔ یہ ترقی زدہ مصلحتی معاشروں میں پیدا ہوتا ہے۔
 - ۲۔ یہ ایسے سیوی 'ملاتی' اور معاشی 'مکروانوں' کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے کہ جن میں معاشرے کے کچھ گروہ اور جماعتیں اپنی مصلحتات اور حیثیت کو نگہ دیتی ہیں اور اس میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔
 - ۳۔ متحدہ مزدور جماعتیں سرمایہ داروں کو پریشانی کر دیتی ہیں اور وہ فاشزم کی حمایت کر کے ان کے اتحاد اور قوت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے فاشزم صرف اسی وقت کامیاب ہوتا ہے کہ جب مزدور جماعتیں شکست کھا جائیں جیسا کہ ۱۹۳۰ء میں اٹلی میں ہوا اور ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۲ء میں جرمنی میں ہوا۔
 - ۴۔ اس کے مدنی اکثر پہلے درجنوں کے متوسط طبقے سے ہوتے ہیں 'جیسے صنعت کار' 'ہنرمند' و 'تجارت' چھوٹے دکاندار' اور کسان' اور ان کا مفاد یہ ہوتا ہے کہ شاید اس تحریک کے دوجہ وہ بچے مفاد حاصل کر سکیں
 - ۵۔ یہ غلی جائداد اور سرمایہ داری کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔
 - ۶۔ یہ بچے تحفظوں کو شکوہ 'جبر' در خوف سے خاموش کر دیتا ہے۔
 - ۷۔ یہ عوام کو متوجہ کرنے کے لئے کسی نظریہ کا سامرا دیتا ہے اور ان کی بے چینی کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے اس خاص خصوصیات میں 'اقتصادی' 'ادارت' 'عزت' 'فرصت' اور وطن' اور نسل کی برتری ہوتی ہیں۔
 - ۸۔ یہ پارحادث اور وسعت پسند نہ پالیسی کو اختیار کرتا ہے۔
- اگر دیکھا جائے تو وہ ملاتی اور معاشی نظام کو جو فاشزم کو پیدا کرتے ہیں اس وقت بھی موجود ہیں۔ فاشزم کے رہنماؤں کو اوک فراہم کے الفاظ میں اسی صورت میں رد کیا جاسکتا ہے کہ جب فرد کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو جمہوری اور اشتراکی معاشرے میں آزادی کے ساتھ نشوونما پانے اور بھلے بھولے کا موقع ملے
- جب بھی ان کے درمیان رکاوٹ والی جائے کی فاشزم کی ہولناکیاں معاشرے کو کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔

فرانسیسی انقلاب

۱۸۹۰ء میں فرانسیسی انقلاب کی دو سو سالہ سالگرہ دنیا بھر میں منائی گئی اس موقع پر مہ فوں نے فرانسیسی انقلاب اور اس کی تاریخ پر مختلف زاویوں اور نقطہ ہائے نظر سے لکھا۔ لمرنسی انقلاب جب سے کہ یہ آیا ہے اس وقت سے مورخوں کے لئے انتہائی دلچسپ اور پتھرہ موضوع رہا ہے وہ اسوں نے انقلاب کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں اور انقلاب سے دوران نظریات کی کش مکش' راء کا تضاد' خصوصیتوں کے ٹکڑے' طبقاتی جدوجہد' کسانوں کی بغاوت' مختلف طبقاتی گروہوں کا دور میں آیا' مہوئیں' انتشار' رہشت گردی' ذر' خوف' اور اس کے ساتھ ہی میں نئے نئے نظریات کا پیدا ہونا' نئے عجبات کا کرنا' اور کئی ملاشیں وجود میں آنا' اس انقلاب کی خصوصیات تھیں' دنیا میں بہت کم ایسے واقعات ہیں کہ جنہوں نے ملاتی معاشروں' اور قوموں کو اس قدر متاثر کیا ہو جیسا کہ فرانسیسی انقلاب نے

ایک مشہور جرمنی مورخ کارل فون روٹک (۱۸۳۸) نے اس کی طرف نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ رومیوں کا زوال' عیسائی مذہب کا آنا' صلیبی جنگیں' تحریک اصلاح مذہب اور پر شک پیس کی انہار گرچہ یہ سب انتہائی اہم واقعات ہیں مگر جنہوں نے دنیا کی تاریخ پر انتہائی اہم اثرات ڈالے ہیں' مکران واقعات کے نتیجے میں دنیا بہت سے مرحلہ ور تبدیل ہوئی' مہب کہ فرانسیسی انقلاب کی دنیا انتہائی چابک غیر متوقع اور سرعت کے ساتھ تبدیل ہوئی کہ اس نے سب کو حیر کر دیا' اور ساتھ ہی میں اس نے صرف یورپ کے برعکس ہی کو نہیں بدلا بلکہ اس کے اثرات دنیا کے کونے کونے میں کسی نہ کسی شکل میں پہنچے اس غلط سے یہ دنیا کا ایک اہم واقعہ ہے۔

انقلاب کے دوران اس قدر سیوی' معاشی و سماجی تحریات ہوئے اور معاشرے کو بدلنے کی کوشش کی گئی کہ آگے چل کر بہت سے ملکوں نے ان تجویز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے معاشروں کو تبدیل کیا' خاص طور پر انقلاب کے دوران جو عناصر تھیاری کی تھیں وہ بہت سے ملکوں میں بعد میں رائج ہوئیں۔ مثلاً فرانس کا تین رنگوں والا جھنڈا' بہت سے آراء ملکوں نے اختیار کیا' اگرچہ انہوں نے رنگوں کا انتخاب اپنی اپنی خواہش و حالات کے مطابق کیا' لہذا اس کا لگایا گیا ہے کہ ۱۹۳۰ء کی دہائی تقریباً ۶۳' ایشیائی و افریقی ملکوں نے تین رنگوں والے جھنڈے کو اپنایا' اور ان کے ذریعہ قوموں' نسلوں' مذہبوں' و زمینوں کی

م سبکی کو عام کیا

فرانسیسی انقلاب نے جرمن اور آسٹریائیوں کو ایک پارٹیوں نے اختیار کیا، جب کہ سارے 'زوی' اور آخرت کے لئے دنیا کے لئے کوئی حق نہیں ہو گئے۔ انقلاب کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے 'انگریز مورخ' ای۔ بی۔ ہاوس ہام لکھتا ہے کہ "آدمی دنیا کا قانونی نظام ان قوانین پر ہے جو کہ انقلاب کے دوران بنائے گئے۔ وہ ملک بھی کہ جو فرانس سے بہت دور ہیں، جیسے کہ اسلامی دنیا پر مت ایران، وہ بھی آج اسی قومیت کی بنیادوں پر ہیں کہ جس کی ابتداء فرانسیسی انقلاب نے کی تھی" اور ان کی سیاسی اصطلاحات میں سے اکثر وہی ہیں جو کہ انقلاب کے دوران وضع کی گئیں تھیں۔"

فرانسیسی لہجے انقلاب پر اس لئے غور کرتے ہیں کہ اس سے دنیا کو بدل دیا، اس نے وہ اپنی اہل قیاموں کا ذکر کرتے ہیں کہ جن کی وجہ سے یہاں انقلاب کامیاب ہوا۔ اس لحاظ سے ان کا خیال ہے کہ انہوں نے قریباً دس کروڑ اور بھاری قیمت ادا کر کے دنیا کو مطلق العنانیت اور اشتراکی نظام سے چھٹکارا دینے میں مدد دی، اور وہ ملک کہ جس پر آج بھی انحصار نظام ہے اس کے لئے فرانسیسی انقلاب راہنمائی کا کام کرنا ہے۔

تاریخ میں فرانسیسی انقلاب نے راہنمائی کا کام سرانجام دیا ہے، اس کے شواہد ہمیں یورپ کے ۱۸۳۰ء تا ۱۸۴۸ء کے انقلابوں میں ملتے ہیں، اور روس میں جو ۱۹۱۷ء کا انقلاب تھا، اس میں بھی فرانسیسی انقلاب سے حاصل شدہ تجزیوں کی جھلک ملتی ہے۔

فرانسیسی انقلاب نے ایک طرف تو انقلابوں اور تہذیبی مائے والوں کو متحد کیا، تو دوسری طرف اس سے رجعت پسند حکمران طبقوں نے بھی سبق حاصل کیا کہ کس طرح سے تہذیب کی ان تحریکوں کو روکا جائے اور کس طرح سے پرانے نظام کو برقرار رکھا جائے، اس لئے حکمران طبقوں نے انقلاب کے حقیقی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا اور خصوصیت سے اس کے ۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۴ء والے پہلو کو خوب اجاگر کیا کہ جسے "شہود کا زمانہ" کہا جاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر انقلاب ہتکار ہے، یعنی 'الفراتفری' اور قتل و غارت گری کے درجہ میں وہ ان دوروں میں کو چاہ کر رہا ہے، اس تنازع کو پیدا کر کے کا مقصد یہ تھا کہ تہذیبی پیش قدمی کی حالت برقی ہے۔

ہاوس ہام نے فرانسیسی انقلاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس نے لوگوں کو تاریخی شعور دیا، وہ یہ سبق دیا کہ تاریخ ان کے عمل سے تہذیب ہو سکتی ہے" اس کا خیال ہے کہ فرانسیسی انقلاب نے دنیا میں تہذیب کے عمل کو مستقل طور پر جاری کر دیا ہے۔

اور اس کی سب سے بڑی شکل مشرقی یورپ اور روس کے واقعات ہیں کہ جس میں تمام ملکوں کے چاروں تہذیبی مائے۔

منہجی مفادات کے رکھنے والوں، ذاتی و نجی ملکیت والوں اور قرض و ادائیگی، مزدوروں اور سرمایہ داروں، اور قومیت پسند نگاہیوں کے درمیان ہو۔

مرکی معاشرے کی آزادانہ تشکیل میں اہم پہلو یہ رہے کہ اس قوم پر ان تمام تاریخی اداروں سے نہیں گزرا جیسے کہ راجہ یا ایلیوں کے ہت سے معاشرے گزرتے تھے یعنی اس کی تباہی اور چاکیزہ دلی میں نہ ہوا یہ ہے کہ مرئی معاشرہ اُن طریقہ سے حاصل ہوا اور اس میں جو نئے نوآبادی گار تھے وہ اس کی صورت کو مسلسل بدلتے رہے اور مغربی تھکن کی وجہ سے یہ معاشرہ برابر ترقی کرتا رہا اور آگے کی جانب بدلتا رہا اگرچہ اس معاشرہ میں تاریخ کی تصویر اور اس کا آئینہ صاف نہیں ہے۔ اس نے بعض کاموں کے ورثہ میں نہیں دیا اور انہیں اس بات کا موقع مل گیا کہ وہ نئے سرے سے اپنی تاریخ کی تشکیل کریں۔ لیکن مغربی غارت خانوں نے بھی محسوس کیا تھا کہ بغیر دھکی کے ان کے پاس کوئی ورثہ نہیں ہے کہ جس پر یہ غرور کر سکیں۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ہارو جس نے یہ جگہ لکھا ہے۔ "مغربی بادشاہ کسی کوئی دربار میں جان و مال نہ رکھتا اور انہیں نہیں کوئی طبقہ امر و نہیں کوئی جمع میں کوئی فوج میں کوئی سفارت کاروں کا طبقہ نہیں"۔ کوئی عہدہ نہیں، قلعہ نہیں۔"

امریکی معاشی نے معصومیت کے تصور کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے ان گناہوں کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ جو انہوں نے نقایا ہتھیاروں اور اربھہ سے دہشت گردی کے لئے ورہائے غلامیوں کے ساتھ کیے تھے۔ مذہبی ہتھیاروں کے کل علم اور ان کی تہذیب کو تباہ و برباد کر کے جو زرائع طریقہ سے ناقصہ سمجھ کر یہ تاریخی عمل کا خاتمہ تھا اور تاریخ میں جب تک مذہب اور غیر مذہب قوام میں تسلیم ہوتا ہے تو اس میں ہیں ماندہ قوم تباہ ہو

لیکن فی دنیا کی رسالت نے ہم جہوں کے ساتھ ساتھ ان فرقوں 'ملاحتوں' اور گرد و پیش کے نئے مواقع فراہم کیے کہ جو یورپ میں نہیں مل سکتے تھے اور انکوائری بنیاد پر تعصب کا آثار نہیں اُٹھنے کے وسیع و عریض براعظم میں انہیں اس باب کی ترقی کی گئی کہ وہ کسی اور دار عاقہ میں بندہ سے اپنے عقائد و مذہب کی جان نہ لیں۔

امریکہ کے ایک مشہور مورخ فریڈرک ٹینکس رائے نے "امریکی تاریخ میں مزاحمت" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ جس میں اس نے کہا کہ جیسے جیسے امریکہ کی سرحدیں بڑھتی رہیں، اس طرح سے دفاعی روپ کے اثر سے آزاد ہونا، مگر اور اس کی زندگی میں آزاوی اور خود مختاری بڑھتی رہتی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امریکہ کے لوگوں نے خود اس کی اپنی ضروریات کے نتیجہ میں تشکیل ہوئے۔ اور امریکہ کی جمہوریت کسی نظریہ دان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ اور نہ ہی سے یورپ سے برآمد کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ امریکہ کے جنگوں کی پیداوار ہے۔ اس بات کو امریکہ کے ایک اور مورخ چارلس ہیڈ نے بھی دہرایا ہے کہ امریکی جمہوریت کی تشکیل اس کے اندرونی تضادات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے اور جمہوری روایات کا رقاء اور ترقی جماعتی تضادات کے تصادم کے نتیجہ میں ہوئی یہ تصادم زری اور

جان چلا۔ تاج کو بچانے کے لئے وہ سوتا دکھایا گیا وہ یہ تھا کہ امریکہ ایک خالی درویشانہ مملکت تھی۔ کہ اس کی سر زمینوں کو اسے کیا سونپ دیں گے اعلیٰ محنت و مشقت سے سرسبز زمین اس سے ان کی سر زمین میں مضافات بشمول یہ ملک ختم کیوں نظر نہیں آتا۔ یہی کچھ افریقی باشندوں کے ساتھ کئے گئے سلوک میں تھا۔ ان دونوں صورتوں میں (۱) جہاں جرم کی کوئی محفل نظر نہیں آتی۔

مخصوصیت کے ساتھ دوسری اہم خصوصیت جو امریکہ کی ترقی کے بعد پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ امریکی ماحول "قابلِ تغیر ہے" ان کے اس نظریہ کو اس وقت اور تعزیت ملی جب پہلی اور دوسری جنگوں میں لڑائی کے نتیجہ میں امریکیوں کو دروست فائدہ ہوئے اور قابلِ تغیر قوت اس وقت دروست طور پر متاثر ہوئی کہ جب وقت نام میں نہیں دروست فائدہ ہوا۔ لہٰذا اس تصور اور حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے امریکی ہر اختیار اور حربہ و شہنشاہی کرنا چاہتے ہیں۔ اسی کے ایسا ہی کل مرتبہ بیرونی ماحول یا ماحول نام چمکنے والے ہی تھے۔ وقت نام کی جنگ میں ان کے قابلِ تغیر حیثیت کو جو نقصان پہنچا اس کا راز انہوں نے مطلق کی جنگ میں کر دیا اور اسی لئے مل کا یہ بیان اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے بعد سے امریکیوں سے وقت نام کی شکست کا دافع دھل گیا۔ اس کی یہی قابلِ تغیر ذات ہے کہ جو امریکہ کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنا تسلط دنیا میں قائم کرے۔ اس متعدد تحلیل میں ہی۔ تیس۔ سے تا اور اس کی۔ یہ ہے کہ تیسرا رشتہ کے ملکوں میں حکومتوں کے مصلحتی ہے۔ سرکاریوں کو قتل کر دیا ہے اور انہیں سزا دیا ہے۔

اس لئے مصروفیت اور ناقابلِ تغیر یہ دونوں خصوصیات امریکی معاشرہ میں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ احساسِ جرم کے عین وقت میں وہ بے ہوش ہیں۔ اس لئے جب تک یہ پوری طرح سے ابھر کر نہیں آئیں گے اس وقت تک امریکہ کے آئینہ رویہ ہفتی وپہلے کے۔

[illegible]

اس سے خدمت میں جڑ سوں سے، قدم کا نظریہ یہ ہیں میں ان قوموں کی تعلیم میں
 اور یہ سب سے اہم اور سب سے اہم قوموں میں خصوصیت رہا ہے
 اور ہے اس لئے غور کرنے (اہل کی پیدا کرنے) تعلیم کا یہ ضروری ہے کہ
 کے یہی حالت میں ان کے لئے مناسب تھا

یہ سب واقعات اس لئے جس میں خصوصیت سے عسکری نظم سے زبانیں
 بنیاد پر عرب قوم پرستی کا تشکیل شروع ہوا اس کی مثال کے مطابق رہا اس سے ہم نے
 کہ ہم سب کو بھی زبانیں کے ذریعہ سمجھا جا، ہے۔ آج کے دور میں یہ گاتو یہ
 دعوت کا باعث ہیں ہو گا اس لئے حمایت اور اسلام نہ سب کی بنیاد پر تو جہاں تشکیل
 میں کر سکتے، یہ دعوت چہ کہ ایک قومی دھبہ ہے اس لئے اس نے یہودیوں کو متحد کر دیا۔
 اس لئے جس زبان کی بنیاد پر عرب قوم پرستی کی تشکیل ہوئی تو اس میں سب سے

1

وہاں خاص عرب میرٹوں نے یہ کہہ کر اس صورت میں وہ نہ ہی قصبات سے باز رہ ہو کر عرب قوم میں شامل ہو گئے۔ اور انہی نے اسوں نے عرب لیون کی ترقی اور نشوونما میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا اور یہ وہ دور ہے کہ جس میں عربی میں تخلیقی ادب و تحقیقی علوم سے مکے اور لیون کو وسیع و پرامن بنا دیا۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں عرب قوم پرستی اپنے عروج پر تھی۔ جلیل عبدالناصر کی سربراہی میں عرب ملکوں میں قوم پرستی کے دھاتے بھرت تھے۔

مگر جس عصر نے عربی قوم پرستی، نقصان پہنچا دیا، نہ صرف عربی، شام میں بھی یہی
 سہی ہوئی۔ عربوں نے ہاتھ میں 'حق' کے نام سے وہ قوم پرستی لے لی، جس سے
 ملوہ پر امتیاز کیا، اور ایسے استحکام کی خاطر اپنے مخالفوں کو سختی سے کھلا، اس کا نتیجہ یہ
 کہ ایک پابندی کی حکمت پیدا ہوئی، اور سرحدیں کی وجہ سے عربی ریاست قدر
 بہت تھیں چھوہ گئیں، اور اگر کوئی سیاسی تبدیلی بھی آئی تو وہ فوجی انقلاب کے ذریعہ ہی
 کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے ملحق و معاشی مسائل حل ہونے کے بجائے جو بڑھتے
 گئے، ان سے بڑھتے چلے گئے، اور قوم پرستی اور مذہب سے نااہلی رہا
 اور یہ قوم پرستی اور مذہب پرستی، جس نے ان ملکوں میں پیدا کی تھی۔

ہر قوم کے لیے بیکہ خود کشی سے باز رہنا ہے۔ یہ عقیدہ کیا ہے؟ یہ کہ ہر قوم کو اپنی حدود میں رہ کر اپنی قوم پرست اور غریب تھا، اس لیے مغرب اور مسیحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے عربوں کو سلام کی جگہ پر متحد ہونا چاہئے اور قوم پرستی سے چھٹکارا لانا چاہئے۔

اس میں امریکی اور اسرائیلی مفادات بھی متھے کہ عرب قوم پرستی کو کھڑا کیا جائے۔
ور یہ ہو آپس میں جھنجھک میں صورت میں ابھری ہے اسے روکا جائے، اس سے عرب قوم پرستی

کے مقابلہ میں نہیں پیدا پرستی کی نوجو ضرورت تھی 'ہام میں کہ جس نے عرب پیش ازم پر یہ معاملہ کیا ہے وہ ایل رائے دیتے ہوئے گناہ کہ جس طرح سے یہ اسلام ازم خاص سماجی حالات میں پیدا ہو تھا اور وقت کے ساتھ ختم ہو گیا' یہی صورت حال اسلام کے سیاسی استعمال کی ہے 'یہ لوگوں کی ضروریات اور مفادات کے نتیجے میں پیدا نہیں ہو سکتا' بلکہ یہی بحران کی پیداوار ہے اور اسی لئے اس کا یہ کردار جلد ہی ختم ہو جائے گا۔

اسلام کے اندر جدوجہد

محقق اذکیہ سے اپنی کتاب 'اسلام کے اندر جدوجہد' میں یہ معاملہ کیا ہے کہ جدید دور میں حالات میں تبدیلیوں اور نئے چیلنجوں کی بنا پر 'اصلاح کے اندر یا بد میں' 'اسلام' خاص طور سے جب نوآبادیاتی دور ختم ہوا اور اسلامی ملک آزاد ہوئے تو ان ملکوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اپنی شناخت کو کس طرح سے قائم کیا جائے 'شناخت کے اس مسئلہ نے کئی مسائل کو پیدا کیا' وہ یہ کہ یہ شناخت دوسرے کی بنیاد پر ہو 'علوم و فلسفہ کی' اس کے نتیجے میں بنیاد پرستی اور سیکولر قوتوں کے درمیان رہ مت کش مکش شروع ہوئی اور اس وقت اسلامی ملک اس بحران سے دوچار ہیں کہ اپنی شناخت کو کس بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

سیکولر ازم اور مذہب کے درمیان تضاد تقریباً دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں دم ہے 'میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ سے زیادہ دوچار مذہب اور اسی لئے دہلی میں ایسی بات کی 'تو ششیں ہوئیں کہ اس مسئلہ کو اس طرح سے حل کیا جائے' پھر آگے آئے 'اس لئے' 'اور کمزور' 'کا نظریہ پیش کیا' اس کے تحت درجہ حالات یہ ہیں کہ اس کی بنیاد پرستی دنیوی طاقت بادشاہ کے پاس اگرچہ تھی اس شخص سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو 'اور پورے قرون وسطیٰ میں 'یورپ میں دنیوی اور دنیوی طاقت کے درمیان اس بات پر جھگڑے ہوتے رہے کہ ان میں سے دنیوی طاقت در کون ہے' لیکن یورپ میں جیسے جیسے سائنس و سماجی علوم میں ترقی ہوئی رہی اسی طرح سے مذہب کمزور ہوتا رہا 'یہاں سیاسی و سماجی اور سماجی حالات نے دہشت اور مذہب کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ اور پھر یورپ میں سیکولر ازم کا جو نظریہ پیدا ہوا 'اس کی بھی مختلف جہتیں ہیں' مثلاً یورپ کی جمہوری ریاستوں میں سیکولر ازم کا نظریہ اور ہے 'اور سوشلسٹ ریاستوں میں اسے اور طرح سے دیکھا گیا اور اس پر عمل کیا گیا' روس اور دوسری سوشلسٹ جمہوریوں میں سیکولر ازم کی شکل الحاد کی صورت میں ظاہر ہوئی کیونکہ ان ملکوں نے مذہب کو سرکاری و فنی دونوں پہلوؤں سے بالکل خارج کر دیا تھا جب کہ یورپ کی جمہوریوں میں مذہب ریاست میں تو دخل نہیں دیتا ہے مگر یہ فنی زندگی میں داخل رہتا ہے 'ذوالنہ یورپ نے یورپی سیکولر ازم کی جو تعریف کی ہے' اس کے مطابق سیکولر ازم کا نظریہ ہے کہ جو فرد کو پوری پوری آزادی دیتا ہے کیونکہ ان شرائط کے ساتھ کہ وہ دوسرے مذہب میں دخل اندازی نہیں کرتے۔ ریاست

۱۔ تو کوئی درمب ہوتا ہے اور۔ وہ کسی بھی درمب کے فرض یا تبلیغ کو محسوس کرتی ہے۔
 لیکن حال تک اسلام کی بعیت کا تعلق ہے۔ اس میں سیکور ازم کی کچھ چیزیں ہیں۔
 وہی شکل میں جو کوئی گھٹائش نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام میں درمب دو ریاست دونوں ایک
 دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور ان میں کسی بھی صورت میں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا
 ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں اور ان کے مابین یہ حدیں ہیں کہ وہ
 اس میں۔ جدید چیزوں کا سامنا کریں اور ان کو حل کریں۔ کیونکہ قابو نہیں۔ اس کے
 سے اسلام میں جو رتبہ رہا ہے۔ اس سے مختلف مسائل و مسائل نے علیحدہ
 علیحدہ ریاستوں، اختیار یا مسئلہ ترکی میں کمالی اہمیت کے لئے ترکی کی پسماندگی کا دھار
 و سب و قوریا اور یہ تصور ہے۔ ترکی کی شناخت اور رہی کے سے وہی اثرات و اس میں
 ہو جائے اور اس کی جگہ ملحق سیکور نظام رائج کیا جائے۔ اس لئے اگر آج بھی ترکی
 سوویت ریکو۔ اس سے علیحدہ۔ پر قائم ہے۔ مگر ساتھ میں وہاں ہر سہ سہ استہماتی
 میں اس میں سب و قوریا کے مشابہت سے قائم رہا۔ حالانکہ ان میں اور بھی سب و قوریا

شرقی وسطی میں تھوڑے عرصہ کے لئے عربی قوم پرسی نے سلام کو دھکیل کر پیچھے کر دیا۔ لیکن جب عرب قوم پرست رہا ہے آفرات رویوں کے ساتھ حکومت کرنا شروع کیا اور لوگوں کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہے تو اس کی ان ناکامیوں پر بیوروکریسیوں نے اپنی تحریک کی داغ بیل ڈالی۔ چنانچہ ایران میں جو بیوروکریسیوں کو حکومت ملی ہے اس میں وہاں کی سوشلسٹ حکومت کی مثال ہے۔ یہی صورت حال مصر کی ہے کہ جہاں سوشلسٹ اور مئی سیرا کہ ملک کو معاشی بحران سے لٹکانے میں ناکام ہو گئے اور پھر اس لوگوں کے لئے بدجب کے خلاف ور کوئی دستہ نہیں جھوڑا۔ اس کے علاوہ اسرائیل کے ہاتھوں مسلسل شکستوں، امریکہ اور یورپ کے مخالف رویوں سے لوگوں کو اس قدر مایوس کر دیا ہے کہ ان کے لئے اس سے بدجب کے ور کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں ہے کہ جس کے رویہ و اپنی مخالفت کو اجاگر کریں اور اپنے مسائل کے حل کے لئے اسے اختیار کریں۔ ایران کے انقلاب رہنمائی میں اور بھی یہ تھوڑی سی بات

مشرق وسطیٰ کے متعلق میں فرات ملکوں میں جہاں جہاں اسلام ہے، ان کے تحریکات ان سے مختلف ہیں۔ مثلاً سوڈان کی مثال لیجئے، اس کو عربوں نے فتح کیا، اور حج کے بعد ان کی رہائش اور عرصہ تک کو بدل ڈالا۔ اس کے نتیجہ میں ان کی مذہبی شناخت غمٹ ہو گئی، اور

اب وہ خود کو عرب اور عرب دنیا سے منسلک کئے ہوئے ہیں اور یہ بہت بڑے بڑے اور
 خود کو زیادہ سے زیادہ مذہبی ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن الحریۃ کے دوسرے ملک جن میں
 امریکا، سوویت یونین، انگلینڈ اور صومالیہ شامل ہیں یہ عربوں کے ہاتھوں فتح نہیں ہوئے
 تھے۔ بلکہ یہاں لوگوں نے ہمیں کے ذریعہ اپنا مذہب بدلے۔ اس لئے انہوں نے اپنی قبائلی
 روایات کو ترک نہیں کیا بلکہ انہیں اسلام سے ہم تنہا کر دیا اس لئے ان کے پاس
 مذہبی عقائد - میں تشدد نہیں ہے بلکہ قوت پر اشتہار ہے اس لئے تو آپادینی دور حکومت
 میں انہوں نے آسمانی سے پیکور لوگوں اور روایات کو اختیار کر لیا

مشرق وکرو نے اپنی کتاب میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تصویر بنی اور اس کی پیش
کش کی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہندوستان میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ان سے بالکل بے خبر ہیں۔
اس سے اس میں یہ صافیت ختم ہو رہی ہے کہ کئی طرح سے ہندوستان کی سیاست اور
زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں حصہ لیں اور اپنی موجودگی کا احساس دلائیں۔ اس کے
بجائے، انہوں نے اپنی کاساؤں سے رہے ہیں اور عمل دینا زندگی سے برابر گنہ رہے ہیں۔
اس نے ہندوؤں میں جو فرقہ راز اور عربیوں اور مسلمانوں میں یہ ان کے وجود کے لئے ایک بڑا
خطرہ بن کر سامنے آ رہی ہیں اس لئے ان سے بڑھتے اور مقابلہ کر سکتے ہوئے ضروری
ہے کہ سیکرٹریزم کا ساتھ دیا جائے اور اس کے اداروں کو مضبوط کیا جائے۔ کیونکہ اگر
ہر ایک کے درمیان ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ تصادم کو اور زیادہ خون ریز بنا دے گا
اور اس کے نتیجے میں فرقہ واریت اور دیادہ پھیلے گی۔

لڑنے والوں نے اور جنرل غوثی کے "برادری اور تقرب: مشرق وسطیٰ اور پاکستان میں" ان ملکوں میں برادری کی تشکیل اور اس کے نظریے پر مختلف اسکالرز کے مقالے جمع کیے ہیں اور اس پت کا تجزیہ کیا ہے کہ نو برادری کے ختم ہونے کے بعد مشرق وسطیٰ اور جنوب ایشیا کی برادریوں میں کیا ک تبدیلیاں آئیں گیں صریح سے وہ تو قوموں کی شکل میں رہیں اور اس طرح ان ہی قوموں کو سیاسی، سماجی اور معاشی مشکلات کا سامنا ہوا اور وہ ک بنیاد پر اس پر قابو پاسنے کاوش کر رہی ہیں

ان وقت میں جس مکتوب پر لکھ دیا گیا ہے کہ یہ کہ ان ملکوں میں جو بھی سیاسی یا
مذہبی تبدیلیاں آتی ہیں، وہ صرف شہریوں میں آتی ہیں جبکہ دیہات ان تبدیلیوں کا مرکز
نہیں رہے، جس شہری مرکز میں سیاسی و سماجی اور مذہبی مرکز میں عمل رہے ہیں
اور محاشرے میں بدلیاں آتے رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کو آزادی کے بعد کسی نظریے

کی ضرورت تھی کہ جس کی بنیاد پر یہ نذر کو مستحکم کر سکیں اور لوگوں کی وفاداری حاصل کر سکیں اس لئے ترکی میں کمال ازم، مصر میں ناصر ازم، شام اور عراق میں بیث ازم، امریکہ میں صیہونیت، ایران میں پہلوی ازم، پاکستان میں مسلم ازم، روس میں کمیونزم کی گئی تھی۔ انہیں اپنے ممالک میں اس دہشت کی جانب نشان دہی کی ہے کہ مشرق وسطیٰ اور عرب ایشیاء کے ممالک نے جو تاریخی ظلم میں رہے ہیں ان ملکوں میں مغرب کے خلاف بغاوت، بغاوت اور بغاوت ہے۔ یہ بہت سے ملکوں کے کہہ رہے ہیں کہ یہ کسی مغربی طاقت کے زیرِ تسلط نہیں رہے۔ مغربی طاقت کے نتیجے میں ان ملکوں میں اسلام ایسے تفریق اور نظام کی شکل میں امر ہے کہ جو ہمیں نہ صرف شرافت فراہم کرتا ہے بلکہ مغرب سے جدا جدا رہنے کے اختیار بھی فراہم کرتا ہے۔

یہی آج کل کی مہجوں عام اصطلاح بنیاد پرستی کے بجائے اسلام ازم کی اصطلاح کو استعمال کرتا ہوا پند کرتی ہے۔ اس نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اسلام بحیثیت مذہب اور تفریق کے ہر سلطان ملک میں مختلف ہے۔ اور اس کی اس تبدیلی میں اس ملک کے سیاسی، معاشی، سماجی اور تفریقی حالات و احوال کو بڑا دخل ہے۔ مثلاً یسٹ اور سٹرا میں اسلام بڑا نرم مزاج اور قوت پرورش کا حامل ہے۔ تاہم اور یسٹ میں کہ جہاں کی مذہب اور اقوام دہشت پسند ہیں وہاں بھی یہ پختہ نہیں ہے۔ جب کہ مصر، شام، سوڈان، ایران اور پاکستان میں اس کی شکل بڑی انتہا پسندی کی ہے اور یہ اسلام کے حوالہ اور تمام حرمت کی ہے۔

فریڈن نے کہا ہے کہ یہاں جو ایریاں کے انقلاب پر ہے اس کا تجزیہ کیا ہے کہ یہ پہلا خطاب ہے جو بدستور بنیاد پرستی اور اس کی جو اہم خصوصیات ہیں وہ یہ ہیں: یہ تمام، یعنی انہوں نے خلاف ہے، نہیں روکتے اور معاشرہ کو وہیں اسی میں پکڑنا چاہتے ہیں۔ قوم پرستی کے نظریہ نے خلاف ہے، بدستور بنیاد پرستی کا حامی ہے۔ یہ مسیحیت کے بھی خلاف ہے اور اس میں تمام اللہ تعالیٰ پرستی اور ان کے عقیدے کے ہاتھوں میں ہے۔

ان انقلاب میں قوم کی وجہ سے دوسرے مذاہب سے نفرت ہے، وہ ہیں: یہ ایک ایسے معاشرہ میں تو ہے کہ جو سماجی و معاشی عام سے ترقی یافتہ تھا یعنی روس اور چینی معاشرہ کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ یہ انقلاب کام زور ہے کہ چینی، کیمونزم، روسیٹ نام کے انقلابات دہشتوں میں گئے اور وہاں سے یہ فہموں میں پھیل ہوئے اس

سب شہادت و قدم نظام کو املا کس اور مظاہر کے ذریعہ ختم کیا، مسیح، انقلاب کے حامی ہیں۔ اور اس کی کامیابی میں کسی غیر ملکی طاقت کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔

یہاں پر انقلاب کے بعد کس حد تک ایسے مسائل کو حل کر پائے گا۔ اس کا جواب دینے کے لئے حالات یہ ہیں کہ چونکہ یہ ملک مغرب اور جڑت کے ذریعہ اس سے لوگوں کو قابو میں رکھا ہے، مگر آہستہ آہستہ مغرب کے خلاف اور ہمسایہ ملکوں کے خلاف نظریوں سے لوگوں کو وقار نہیں رکھا پائے گا، اس لئے ایران کی نئی بدستور اب اس پر۔ کی کو مشعل کر رہی ہے کہ جہاں کے اندر درجنوں کم یو نیٹ ہیں اور جو مسائل درپیش ہیں ان کو حقیقت پسندی کے ساتھ حل کیا جائے، مگر رجسٹر کی حکومت اس میں کامیاب ہوتی ہے تو ایران میں تبدیلی آ سکتی ہے۔ دوسرا ہاں حدت اور رہا، فراہم ہوں گے اور اس کے نتیجے میں اور رہا انشکار چھنے گا۔

عربوں کے معاشرے میں رنگ و نسل

برٹراڈ لٹونس برطانوی منشق ہے کہ جس نے اسلامی تاریخ اور تمدن پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں "اسامیوں کی ہند" اور "مسلمان اور یورپ کی دریافت" مشہور ہیں۔ اصول سے اپنی تازہ تصنیف "مشرق و وسطیٰ میں نسل اور غلامی" میں اسلامی معاشرہ میں ان تعصبات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ عروقت کے ساتھ ساتھ نسل اور غلامی کے سلسلہ میں اختیار کئے گئے۔ یہ تعصبات بیش ایک سے نہیں رہے بلکہ ان میں تبدیلی آتی رہی، مثلاً جب اسلام سے پہلے عربوں نے عرب کے باہر علاقوں پر قبضہ کر لیا تو اس کے نتیجہ میں وہ لوگ کو عربوں سے اعلیٰ و برتر سمجھنے لگے تھے، لیکن جب اسلام سامنے کے بعد عربوں سے برتری ختم کر لیا اور ایرانیوں کو شکستیں دیں تو ان کا برتری کا مقام ختم ہو گیا اور اب عرب خود کو اعلیٰ و افضل سمجھنے لگے۔

عربوں میں جب تک معاشرہ تہنل میں تقسیم تھا۔ اس وقت تک ان میں رنگ اور نسل کی بنا پر کسی سے تعصب نہیں برتا جاتا تھا اور اسلام نے بھی مساوات پر زور دیا ہے اور نسل و نژاد کو بے اہم سمجھا ہے۔ لیکن عملی طور پر یہ ہوا کہ جب عرب قبائلی تھے ہوتے اور ایک قوم کی شکل اختیار کی اور دوسری قوموں کو شکستیں دے کر ان کے علاقوں پر تصرف تو انہوں نے عربوں اور غیر عربوں کی شخصیات قائم کی اور عرب معاشرہ میں ایک طبقہ پیدا ہوا کہ غیر عرب تھے مگر مسلمان بھی تھے۔ یہ لوگ "مملوک" کہلاتے۔

چونکہ حوالہ کے طبقہ کو عرب معاشرہ میں باعزت مقام نہیں ملا اس لئے یہ لوگ ریاست اور معاشرے کے خلاف سازشوں اور ہتکدہوں میں مصروف رہے اور جب عباسیوں نے امویوں کے خلاف مسلح بغاوت کی تو اس میں غیر عرب پیش پیش تھے اور سی نے صدی ۱۰ میں پہلی مرتبہ عرب برابر اور مساوی طور پر ایک ہوئے اور ان میں جو نسل تفریق تھی وہ ختم ہوئی، لیکن اس کے ختم ہوتے ہوئے ایک اور تفریق پیدا ہوئی کہ جو رنگ کی بنیادوں پر تھی۔

اگرچہ عربوں میں اسلام سے پہلے جیسی نسل کے لوگ تھے اور اسلام میں ان لوگوں کو برابر کا مقام دیا گیا تھا، لیکن افریقی ممالک کی فاتحانے بعد جب حبشی لوگوں کو غلام بنا کر ان کی عمارت شروع ہو گئی، ان کے خلاف تعصب کی جڑیں گہری ہو گئیں۔ اسی وقت (۸۸۹ء) عربی کا ایک مشہور انتہا پسند لوگوں کے ہارے میں لکھتا ہے کہ یہ بد صورت

اور بے ادب غلامی ہے، کیونکہ یہ گرم ملکوں میں رہتے ہیں اس لئے گرمی کی وجہ سے یہ رحم و ہمدردی میں تیار نہ ہو سکتے ہیں اور ان کے بال جھکڑ لے ہو جاتے ہیں اس سے ان کے جیٹھے ہو کر سے ہارے میں اس قسم کے خیالات پھیلنے لگے کہ یہ غلامی اور غلامی سے مراد ہے اور طاعت گزار ہیں، ان میں انسانی خوبیوں اور اوصاف بہت کم ہیں۔ یہ لوگ جانوروں کی مانند ہیں۔

جب عربوں نے ان ملکوں کو فتح کیا کہ جہاں کے لوگوں کا رنگ سفید تھا تو اس کے نتیجہ میں کسے لوگوں کا سماجی مقام اور بھی گر گیا۔ مثلاً وہ نظام کہ جن کا رنگ سفید اور گورا ہوتا وہ مملوک کہلاتے تھے۔ حبشی لوگوں کے لئے عید کا منظر اشتعال ہوتا تھا اور کفر سے لوگوں کو کھڑا نہ کھڑا کرتے تھے۔ جب کہ گرم رنگ و سب سے اعلیٰ حد سے بے جاتے تھے، تو ان نظامیہ میں اس وجہ سے ان کا دور رسن پیدا ہو گیا۔

بعد میں جب مسلمان خاندانوں میں اندرونی طور پر کھڑوں میں "تواہر" سے آپ لداہوں پر مشتمل گروہوں کے درجہ پہنچے خود کو مستحکم کیا اس سے ۱۰ صدی عیسوی میں اس حرم کے عیسویوں کی جوہیں مسلمان ملکوں میں قائم ہونا شروع ہو گئیں۔ کیونکہ عیسویوں پر مشتمل جوہیں اپنے حکمرانوں کی دلاوار ہوئی تھیں اور اس کے امکانات کی تحصیل میں ماموروں اور ہتھیاروں کا حاکم کرتی تھیں۔ لیکن جب نہیں اس بہت کا حواس ہوا کہ ان کی حالت و قوت کی وجہ سے بادشاہ اور اس کا خاندان حکمران ہے تو انہوں نے بادشاہ کو کھڑے بنایا کر اصل طاقت خود اختیار کر لی اور کئی صورتوں میں حکمران خاندانوں کو ہٹا کر ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کر لی، جیسا کہ مصر میں مملوک خاندان "اور بغداد میں خاندان لہلال۔

مسلمان ملکوں میں سفید رنگ کے غلاموں کی ایک بہت زیادہ تھی اس میں اس وقت کی کئی جگہ کہ اندلس میں صدی ۱۰ میں مسلمانوں نے مشرقی یورپ میں اپنا اقتدار قائم کر لیا اور پھر کہ کاف کے علاقوں اور کربیا میں اس کی حکومت قائم ہو گئی اس لئے سفید رنگ کے غلاموں کی جگہ حبشی غلاموں نے لے لی۔ انیسویں صدی میں یورپ میں غلامی کے خلاف مہم کا آغاز ہوا، لیکن سلاوی ملکوں میں حکمرانوں اور غلاموں نے اس کی مخالفت کی۔ مثلاً مجار کے شیخ ہمای نے اسے صدی ۱۹ میں انہیں کے خلاف قرار دیا، لیکن چونکہ دنیا بھر میں اس کی سخت مخالفت تھی اس لئے مسلمان ملکوں کو بھی آہستہ آہستہ غلامی ختم کرنا پڑی اور ۱۹۴۳ء میں بین میں اس کا خاتمہ ہو گیا جب کہ یورپ میں یہ ۱۹۸۰ء تک تھی۔

اس مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگرچہ اسلامی تعلیمات میں رنگ و نسل کی

ہندوہ ہر قسم کے تعصب کی خدمت کی گئی ہے، لیکن عمل طور پر مسلمان معاشرے میں یہ تعصبات قائم رہے اور پوری توجہ میں ان غیابوں پر مبنی رہے جس سے اس کے برادرانہ کے نفاذ میں اس غلطیوں کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ جن غلطیوں سے ہمارے سیاسی جدیات کو تسکین ملتی ہے، کیونکہ ان غلطیوں کی مٹائی دی اور ان کے اقرار کے بعد ہی ہم معاشرے کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ ورنہ اس میں جو تعصبات ہیں نہیں دور کر سکتے ہیں۔

بہن چندر اور ہندوستان کی قومی آزادی

بہن چندر ہندوستان کے ان مورخوں میں سے ہیں کہ جنہوں نے تاریخ کو ایک وسیع نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔ خاص طور سے وہ ہندوستان کی تاریخ کے نو آزادیی، سامراجی، برطانوی دور حکومت اور ان کے خلاف ہونے والی تحریک آزادی کے بہترین میں سے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں جس میں "کیونٹرم ان اڈونٹ انڈیا" بشمول "ڈم اینڈ کلوشل ڈم ان اڈونٹ انڈیا" اور "رائز چڑھو تھ آف انڈیا" بشمول "ڈم" خاص طور سے مشہور ہیں۔ یہاں اس کی ایک مختصر کتاب "انڈیا" بشمول "سوسائٹ کے بارے میں تصویق" مانا ہے۔

پاکستان میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک کش مکش دور تصادم کی تاریخ سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے ہندوستانوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ آزادی نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس نقطہ نظر کی وجہ سے ہم نو آزادیی دور اس کے استعمال اور اس کی خرابیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ وہ جدوجہد آزادی اور ہمہ جہت سرگرمیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بہن چندر نے اپنی اس کتاب میں انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کی تاریخ پیش کرتے ہوئے اس کے اہم منصوبوں، نظریات، جڑوں اور راہنمائیوں اور حوام کے درمیان تعلقات کو بیان کیا ہے۔

بہن چندر اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں سب سے بڑا حصہ معاشی استحصال کا ہے کہ برطانوی حکومت نے کس طرح سے حوام پر فوجد سے زیادہ ٹیکس عائد کیے۔ انگریزی تہذیب ہندوؤں کو ہندوستان میں ماز میں دے کر ان کی خیریت کو، ہیں مقرر کیے، برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان غیر مساوی تجارت کو فروغ دیا۔ اور برطانوی سرمایہ کو ہندوستان میں لگا کر خوب منافع کمایا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ کے ہر طبقہ میں نو آزادیی نظام کے خلاف جدیات ابھرنا شروع ہوئے، اور ان باتوں کے ساتھ ساتھ ان کے مابین مسائل اور سیاسی خواہشات نے اس تحریک میں مزید جان والدی، کیونکہ جدوجہد آزادی میں جس باتوں پر زور دیا گیا وہ جمہوری و سیکور معاشرے کا قیام اور آزادی رائے، تحریر و تقریر، جس کو کہ معاشرے کے ہر شخص کے لئے دلچسپی کا باعث تھی۔

تحریک کے راہنماؤں نے خاص طور پر اس بات کی کوشش کی کہ ہیریل ڈم کے

کردار اور اس کے استحصال کو واضح کریں، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی ایمپیرل ازم اور برطانوی عوام دو پیچیدہ طبقہ، جو مل جاتے ہیں، اسٹے ایمپیرل ازم پر تنقید کی جائے مگر برطانوی عوام اور برٹش کنگ کے مابین کی سیاسی فاصلہ یہ ہوا کہ دونوں معاشرہ کے ہر لوگ در ان کی حدود میں تحریک کے ساتھ ہو گئیں۔

تحریک کے رہنماؤں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں اچھے دلی انتظامی اور آزادی کی تحریکوں کی حمایت کی۔ جب یورپ میں فاشزم بھرا اور طاقتور ہونا شروع ہو تو اس کی بندوستان کے رہنماؤں کی طرف سے ہر چہ مخالفت کی گئی۔ اس کے علاوہ تحریک آزادی نے عربوں کی جدوجہد، عورتوں کی آزادی اور اچھوت لوگوں کے حقوق کی آواز اٹھائی۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ہندوستان کی قومی تحریک آزادی ایک وسیع اور ہم گیر شکل میں ابھری کہ جس میں ہر طبقہ اور کلاس کے لوگوں نے دلچسپی لی اور تحریک میں عملی طور پر حصہ لیا۔

تحریک کے رہنماؤں نے اس بات کی کوشش کی کہ خودمختاری حکومت کے کردار کو اچھی طرح سمجھا جائے کیونکہ اس صورت میں اس کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اس کے خلاف جدوجہد کر سکیں۔ خودمختاری حکومت کے وہ اہم پہلو تھے، ایک تو اس کا روشن خیال جس کے تحت اس نے اس بات کی اجازت دی تھی کہ لوگ قانونی طور پر اپنے حقوق کے لئے لڑ سکیں اور قانون کی بالادستی کو استعمال کر سکیں۔ دوسری طرف برطانوی حکومت نے اپنی قوت و طاقت اور دہشت کو لوگوں کے دلوں پر بٹھا رکھا تھا اور لوگوں میں یہ خیال عام تھا کہ حکومت کو شکست دینا اور اس کے خلاف جدوجہد کرنا بیکار ہے اس طرح خودمختاری نظام بدلتا رہتا رہتا اور استحصال دونوں پہلو رکھتا تھا۔

جب گاندھی نے قومی تحریک آزادی کی رہبرائی اختیار کی تو اس سے خودمختاری نظام کے خلاف لڑنے کے لئے عدم تشدد کی پالیسی کو اختیار کیا، دیکھا جائے تو اس قسم کا رویہ صرف برطانوی حکومت میں ہی اختیار کیا جاسکتا تھا کیونکہ ان کی حکومت میں شہروں کے حقوق کی ضمانت تھی اور قانون کا احترام تھا، اگر اس قسم کی پالیسی راجہ دوس یا برمنی کے ہاتھ کے خلاف استعمال ہوتی تو وہ جبر، تشدد اور طاقت سے اسے کچل کر رکھ دیتے۔ لیکن چونکہ لوگوں کو احساس تھا کہ برطانوی حکومت میں انہیں یہ حق ہے اور اس کے حق کی تاحلی حیثیت ہے اس لئے وہ اس میں شامل ہوئے اور انہیں کسی قسم کا ڈر یا خوف محسوس نہیں ہوا۔

اسی لئے جب رہنماؤں نے یہ اندازہ لگایا کہ لوگ اس کے ساتھ آئے ہیں تو اپنی طرف پر تیار ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو محرک کرنے کے لئے جسے "جوس" مظاہرے، اسٹراٹیک کے طریقوں کو استعمال کیا اور عدم تعاون کی تحریک سے اسے کڑھادی کے لباس کو اختیار کرنے کے طریقوں سے لوگوں میں ایک بے جذبہ اور جوش پیدا کیا۔ تحریک نے جس حکمت عملی کو اختیار کیا اس کو گراپی کے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ برطانوی حکومت کے خلاف لڑنے کے لئے عوامی جنگ کی تیاری کی گئی اور کوشش کی گئی کہ ہر جماعت و طبقہ کے لوگوں کو اس میں شامل کیا جائے تاکہ تحریک کا دائرہ وسیع ہو جائے۔

اس جنگ میں جو سوئز حبہ اختیار کیا گیا وہ جدوجہد، صلح، جدوجہد کا تھا، اس کے پیچھے جو فلسفہ تھا وہ یہ کہ عوام کوئی بھی جنگ مسلسل نہیں لڑ سکتے، انہیں اس "رام اور سانس" لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی توانائی کو دوبارہ سے جمع کر کے جدوجہد میں اور موثر طریقہ سے شامل ہوں۔ مسلسل جدوجہد میں یہ اندیشہ بھی رہتا ہے کہ سیاست و حکومت فروس ہو کر تشددیہ آگیا ہو جائے اور سختی کے ساتھ تحریک کو کچل کر رکھ دے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ جب حکومت یا تحریک اس مرحلہ پر پہنچ جائے تو اس وقت اسے رک جانا چاہئے۔ اور خود اسے عرصہ بعد پھر قوت و طاقت کو بحال کر کے جدوجہد کو آگے بڑھانا چاہئے اس لئے یہ ضروری تھا کہ صرف کسی ایک مرحلہ پر لوگوں کی تمام قوت کو استعمال کر کے صانع نہیں کرنا چاہئے۔ اس نے گاندھی نے گراپی کے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے یہ نہیں کیا کہ تمام قوت کو جمع کر کے قلعہ پر حملہ کرے بلکہ اس کے برعکس یہ کیا کہ اس پر حملہ سے پہلے اس کا حصہ کیا جائے اور پھر آہستہ آہستہ اس کا حصہ کو شک کیا جائے یہاں تک کہ غلط ہو، خود بخود تھک جال دے۔ جن چند کے الفاظ میں گاندھی کے ان باتوں نے کہ جسوں نے اس کی اس حکمت عملی کو نہیں سمجھا، جدوجہد، صلح، جدوجہد پوری طرح سے سمجھ میں نہیں آئی۔ اور انہوں نے اسے کبھی حقیقی جنگ سے بدری سمجھا کبھی قومی جدوجہد سے غدارانہ کبھی ایمپیرل ازم سے تعاون، کبھی اجماعی کمزوری اور کبھی اخلاقی دہلیہ پن۔

اس کے برعکس گاندھی اور اس کے ساتھیوں نے اس بات کی کوشش کی کہ لوگوں کے جدید احساسات، انکوں اور امیدوں کو پوری طرح سمجھا جائے اور تحریک کو بحال اپنی مرضی و خواہش کے تابع نہیں بنایا جائے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ لوگ کس حد تک ان کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ گاندھی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "میرا لوگوں پر ایک مدد تک اثر

ہے اور اس میں قابل ہوں کہ ان کے مسائل کو حل کر سکوں۔ مگر اس کے لئے لوگوں کا ذہنی طور پر تیار ہونا ضروری ہے۔ میں قسمی یہ نہیں کر سکتا کہ لوگوں کی توانائیاں ان مسائل پر استعمال کر سکیں کہ جن میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہو۔

قومی تحریک آزادی نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اہل نوآبادیاتی نظام سے جنگ لڑی جائے اور اس سے آزادی حاصل کی جائے اس لئے تحریک نے کسی خاص نظریہ کو اختیار نہیں کیا۔ اور کوشش کی کہ تمام نظریاتی جماعتیں اور افراد کے ساتھ سمجھوتہ کیا جائے اور انہیں ساتھ میں مل کر رکھا جائے تاکہ اپنے نوآبادیاتی نظام اور امپیریل ازم کا خاتمہ کیا جا سکے۔ کیونکہ دوسری صورت میں تحریک کا اتحاد ٹوٹ جائے گا اور نظریاتی میدانوں پر تقسیم ہو کر جہنمی آگ میں لڑنے لگیں گی۔

چنانچہ چند کے نظریہ کے مطابق برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان کو جو سیاسی ماحول ملے گا وہ سچ اور جامع تھا اور اس میں اس بات کی گنجائش تھی کہ جس میں تمام جماعتوں کو ہدایت کیا جا سکتا تھا اس لئے جمہوری اور سیکولر ہندوستان میں مختلف مذاہب اور نظریاتی جماعتوں کو آزادی ہے کہ اپنے آپٹیل کو قائم رکھنے ہوئے اپنے وجود کو برقرار رکھیں۔

ماؤرن امٹیا

پاکستان میں تاریخ پر جو نصاب کی کتابیں لکھی گئی ہیں اس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ کو محض چند مسلمان تصادم کی شکل میں دکھا دیا جائے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تاریخ کے بارے میں ہمارے طالب علموں کا علم محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ نصاب کی کتابوں کی اہمیت اس سے ہوتی ہے کہ یہ طالب علموں کی شعوریت کے لئے صرف واحد ذریعہ ہوتی ہیں کہ جن کی مدد سے وہ علم حاصل کرتے ہیں اور ان کتابوں میں جو بھی معلومات دی جاتی ہیں۔ انہیں کی بنیاد پر ان کا ذہن ہوتا ہے اور ان کی سوچ بیرونی چیزوں سے ہے۔ کیونکہ ان میں اکثریت کو زندگی کی مصروفیات میں کچھ اور پڑھنے کا موقع نہیں ملتا اور علم میں جو ترقی ہوتی ہے یا جو نئی دریافتیں ہوتی ہیں۔ ان سے وہ بے خبر رہتے ہیں کی وجہ سے ترقی یافتہ معاشرہ میں نصاب کی کتابوں کی تادی پر بحث زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور اس مصدر کے لئے جسموں سے اچریں سے نکال دیا جاتا ہے کہ وہ نصاب کی کتابوں کی تیار میں دوہری تاکہ جدید تحقیق کے رعبہ جو اضافے ہوئے ہیں وہ سب ان کتابوں میں نہ سکیں۔ اگرچہ نصاب کی کتابوں پر توجہ تو ہمارے اس مٹی دی جاتی ہے مگر اس کا مقصد یہ ہونا ہے

کہ نظریہ پاکستان کے خلاف کوئی مولو نہیں آتا چاہے اور صرف انہیں معلومات کو دینا چاہئے کہ جو ہمارے سکولر طبقوں کے مفادات کو پورا کرتے ہوں۔

خاص طور سے نظریاتی طبقوں میں تاریخ بہت زیادہ نقصان اٹھاتی ہے کیونکہ ان طبقوں میں تاریخ کو ریاست کی گہرائی میں گھسوا دیا جاتا ہے اور اس میں حکومت کی ایسی کی غلطیوں پر پردہ ڈال کر ان کے ہر عمل کو صحیح ثابت کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تاریخ حقائق سے پردہ اٹھانے کی بجائے ان پر پردہ ڈالتی ہے۔

سچی عدم میں تاریخ ایک ایسا علم ہے کہ جس میں واقعات و حقائق کو اپنی ادارہ میں بیان کیا جا سکتا ہے اس سلسلہ میں برصغیر ہندوستان کی تاریخ کی مثال ہے کہ جس پر کسی سرکاری سکولر خاندانوں اور اقوام نے حکومت کی جن میں سے کہ آخری گمراہ تھے اس لئے جب اس کی تاریخ کو لکھا جاتا ہے تو اس میں کسی غلطی نظر نہ آتی ہے۔

مثلاً ان میں ایک تاریخ کا نوکیر دیتی تھو نظر ہے کہ جس کے تحت وہ برطانوی اقتدار سے قبل کی تاریخ کو مٹنی ادارہ میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں تاریخ کا قوی نقد نظر وجود میں آتا کہ جو نوآبادیاتی دور کو مکمل طور پر رد کر دیتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کے مثبت پہلو نہیں دیکھا جاتا اس کے مقابلہ میں تاریخ کا ایک اور نقطہ نظر ہے کہ جس میں تاریخ کے عمل کو موضوع طور سے دیکھا گیا ہے تاکہ تاریخی واقعات و رجحانیں تصدیق کے چانچا اور پرکھا جاسکے۔

چنانچہ چند کا تعلق بھی اس مکتبہ فکر سے ہے اور اس کا اظہار ان کی اس کتاب سے ہوتا ہے کہ جو اصول نے ہندوستان کی تاریخ پر بطور نصاب لکھی ہے۔ وہ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اب تک اس کے گیارہ ایڈیشن پچھپ چکے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں صرف سیاسی واقعات اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اثرات کو ہی نہیں دیکھا گیا ہے بلکہ سیاسی عمل کے ساتھ ساتھ سماجی معاشی تحریکوں اور نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ ان کے اثرات عوام کی زندگی پر کیا ہوئے۔ اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس میں منظر اور حوالہ پر روشنی ڈال جائے کہ جس کی وجہ سے انگریزوں کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ ہندوستان پر قابض ہو سکے۔

مثلاً جب محل خاندان کمزور ہوتا شروع ہو اور اس کے نتیجہ میں خود مختار ریاستیں وجود میں آنا شروع ہوئیں۔ تو ان کی پاس رقابوں کا حال۔ شہنشاہ اور شہنشاہ کش سے پورنی

حادثوں کو یہ مواقع فراہم کئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ان کے معاملات میں دخل دیں اور اس طرح سے بے اثر و سرخ کو ہندوستان کی سیاست میں پھیلائیں۔ ان حالات میں سب سے زیادہ مادہ انگریزوں نے اٹھایا اور اس بات کی کوشش کی کہ اس طرح زیادہ سے زیادہ دوست نہیں کریں چنانچہ انہوں نے انتہائی ظالمانہ طریقوں 'سازشوں' اور دھوکہ دہی و فریب بازیوں کے ذریعہ ہندوستان کے ذرائع کا استحصال کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس مرحلہ پر ان کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ مستقل طور پر ہندوستان کے مفکرین میں جڑیں لگائیں گے۔ اس لئے دو ترقی طور پر حالات سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ دوست کر کر انگلستان واپس جانے کے خواہش مند تھے۔ لیکن جب حالات نے انہیں اس بات کے مواقع دیئے کہ وہ ہندوستان پر اپنے اقتدار کو مستحکم کر سکیں تو انہوں نے فوراً اپنی پالیسی ترک کر دی اور ہندوستان کو جدید خطوں پر استوار کرتے ہوئے اس کے سیاسی، سماجی، معاشی اور قانونی ڈھانچوں کو گہرے آہستہ آہستہ بدل دیا۔ اور مختلف مرحلوں میں اصلاحات نافذ کر کے اپنے اقتدار کو مضبوط کر دیا۔

برطانوی قدر اور ان کی اصلاحات کے اثرات سب سے پہلے بنگال میں محسوس کئے گئے۔ وہاں ہندوستان کی تاریخ سے یہی صدی قبلوں کا نام ہوا۔ جس سے ذریعہ ماضی کی فرسودہ روایات سے بھاگ کر پائے کی کوششیں ہوئیں تاکہ ہندوستان کو اپنی مادگی سے نکالا جائے اور جدید روایات سے روشناس کر لیا جائے۔ راجہ رام موہن رائے نے اس سے کہا کہ جس سے ہندو معاشرہ کی اصلاح شروع کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد بنگالیوں نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ماضی کی ایسی روایات کو بدلیں کہ جنہوں نے ان کے معاشرہ کی ترقی کو روک رکھا ہے۔

اس کے متاثرین میں شاہ ہندوستان کا دوسرا بڑا عمل دوسری شکل میں ہوا۔ انہوں نے مغربی نظریات کو اختیار کرنے اور معاشرے کی اصلاح کے لیے انگریزی اقتدار کے خلاف تصویر اٹھائے جس کا نتیجہ ۱۸۵۷ء کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس بغاوت کو سختی کے ساتھ کچل دیا گیا کیونکہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اس کا پوری طرح ساتھ نہیں دیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کی پالیسی میں زبردست تبدیلی آئی۔ اب تک وہ جو اصلاحات کر رہے تھے اور ہندوستان کو جدید بنانے کا جو عمل تھا اس کو انہوں نے چھوڑ دیا بلکہ اس کی جگہ انہوں نے سیاست کے لوازمات کو اور زیادہ بڑھاپا دیا۔ اس کے بعد سے ان کا رویہ بھی ہندوستان کے خلاف ہو گیا اور وہ انہیں 'عذار'، 'غافل'، 'ست' و 'کل' اور

یہ عنوان سمجھنے لگے۔ اب حکومت کرنے کے لئے انہوں نے ہندوستان کے زمینداروں اور جاگیرداروں سے تعاون کرنا شروع کر دیا۔ وہ ان کے رویے سے تسلی بخور زیادہ سے زیادہ نمایاں ہونے لگا۔

اہل ہندوستان نے نوکریات کے اثرات کو اس وقت محسوس کرنا شروع کیا کہ جب انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا اور انہوں نے اپنی پیداوار کی قیمت کے لئے ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کرنا شروع کیا۔ خصوصیت سے کپڑے کی صنعت جو انگلستان کی صنعتی ترقی کے ساتھ میں گہرے تھی۔ اس نے تیسویں صدی میں صنعتی کار اور ہندو بڑی قدر میں بے روزگار کر دیئے اور اس بات پر مجبور ہوئے کہ عام مزدوروں کی حیثیت سے شہروں میں آکر عیسویوں میں کام کریں۔ انگلستان کی فریڈ وائیٹ کی بدولت میں بدتر حال بن گئے۔ مرنے لگے۔ ایک طرف جہاں عام لوگوں کی تعداد بے روزگار ہو رہی تھی۔ وہاں دوسری تہذیب متاثر ہو رہی تھی۔ جو نوآبادیاتی نظام اور اس کے استحصال سے آگاہ ہو رہا تھا اور یہ مطالب کر رہا تھا کہ حکومت کے معاملات و اختیارات میں انہیں بھی حصہ دیا جائے۔ اس میں منکر میں ہندوستان میں قومی تحریک آزادی کی ابتدا ہوئی اور ۱۸۸۵ء میں انگریز پارلیمنٹ نے اس میں حصہ لیا۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں نوآبادیاتی نظام کے لئے انتہائی پس پوری طرح سامنے آ گئے تھے اور وہ دیکھ رہے تھے کہ اس سے نتیجہ میں کس طرح سے سندوس کے آئین کا نوآبادیاتی نظام میں استحصال ہو رہا ہے۔ اس سے انہیں اس بات کا شعور ہوا کہ ہندوستان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکا کہ جب تک وہ معاشی استحصال سے آزاد نہیں ہو گا۔ اور اپنے معاشی ذرائع کو خود اپنے لئے استعمال نہیں کرے گا۔

ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک کئی مرحلوں سے گزری۔ اس کے پچھلے مرحلہ میں ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے معاشرے کی اصلاح کی جائے اور لوگوں کو قیادت جمالت اور فرسودہ نظریات سے نجات دلائی جائے۔ اس کے نتیجہ میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں میں اتحاد کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ تیسویں صدی کے آخر میں قومی آزادی کی تحریک پھر نڈر ہو گئی۔ اور حکومت سے حقوق حاصل کرنے کے لئے انہوں نے دہشت گردی کے حربوں کو اختیار کیا۔ قومی آزادی کی تحریک اس وقت اور پھر تشدد ہو گئی کہ جب حکومت نے ۱۹۰۵ء میں بنگال کو تقسیم کر دیا اس کے نتیجہ میں حکومت پر دھاوا ڈالنے کی عرصہ سے حکومت کی عمارتوں پر بم پھینکے گئے اور قتل کی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی حکومت پر مزید دباؤ ڈالنے کی غرض سے سوڈی تحریک کا اظہار ہوا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی مال کا دخلت کیا جائے اور اس اشیا کا استعمال کیا جائے۔ جب حکومت نے اس کے خلاف اقدامات کئے تو اس کے نتیجہ میں انڈیگر اڈا سرگرمیوں پر مبنی ہو گیا۔ اور انہوں نے انقلابی حربوں کو اختیار کرتے ہوئے 'سب جاتوں کے درجہ حکومت کو ختم کرنا چاہا۔

اس کے ساتھ ہی ملک کی سیاست میں دو تبدیلی آئی۔ پہلی تھی کہ تقسیم بنگال اور پھر ۱۹۰۵ء میں اس کے حاتمہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں لڑنے والا جدت کو پیدا کر دیا اور اس کے نتیجہ میں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا عوام وجود میں آیا۔ جس کے وسیع مسلمانوں نے اس تحریک کو شروع کیا کہ ان کے حقوق عیسائیوں سے ملے چاہئے۔ اس کے نتیجہ میں 'سب جاتوں' میں کرہندوستان کی تقسیم ہوئی۔

ماؤنٹ اینڈریو میں نیشنل ازم اور کلونیل ازم

اس تہذیب میں جن چند نے ان اثرات کا تجزیہ کیا ہے کہ جو برطانوی عہد میں نوآبادیاتی نظام کے نتیجہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس عہد کو سامراجی اور قومی تہذیب کے نظریے سے دیکھا جاتا ہے۔ اور دونوں اس بات کو کوشش کرتے ہیں کہ اپنے اپنے حق میں پورے دلائل دیں۔ مثلاً سامراجی مورخوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت نہیں ہوتی۔ اور وہ اسے جدید فطرت پر نہیں دیتے تو ہندوستان قرون وسطیٰ میں رہتا اور یہاں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہندوستان کا سیاسی، ادبی اور سماجی نظام انتخابی قریب مدداریت کا حامل تھا۔ ذات پات کی تقسیم، بڑے بڑے خاندان، توہمات و اندیشے عائد، آبادی کی 'شریت' سیاسی 'مزانہ' و 'چال' و 'مال' کو طعنت اس کے اہم مسائل تھے اس لئے اس صورت میں ہندوستان میں کسی قسم کی ترقی ناممکن تھی۔

ہندوستان کی سیاسی ترقی بھی صرف اسی وجہ سے ممکن ہو سکی کہ یہاں برطانوی سرمایہ 'آید'۔ ورنہ اس سرمایہ کے بغیر اس کے لئے ناممکن تھا کہ وہ نئی صنعتیں لا سکتا۔ کیونکہ ہندوستان کے پاس زمینیں، 'معدنیات' کی تعداد تو تھی مگر سرمایہ نہیں تھا۔

اس کے جواب میں قومی نقطہ نظر رکھنے والوں نے کہا کہ دراصل یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں صنعتی ترقی ہوئی کیونکہ ہندوستان کے ذریعہ کو برطانیہ کی صنعتی ترقی میں اشتغال کیا گیا۔ اس لئے ہندوستان کی صنعتیں آزاد نہیں تھیں بلکہ یہ برطانوی صنعتوں سے

جڑی ہوں تھیں۔ اس سے مگر ہندوستان میں معاشی تبدیلیاں آئیں۔ تو یہ بغیر کسی صنعتی ترقی سے 'نہیں'۔ اس لئے اگر دیکھا جائے تو برطانوی حکومت ہندوستان کی صنعتی ترقی میں رکاوٹ بن گئی تھی۔ ورنہ اس سے یہ چیز کو نہ مکر رہتے ہوئے کہا جاسکتا تھا کہ ہندوستان برطانیہ کے لئے خام اشیا کی ایک مٹھی بن گیا ہے۔ اور یہ خام مواد برطانوی انجینئروں کے ذریعہ جہازوں میں برطانوی انجینئروں کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ اور پھر تیار کی گئے ہیں اس مال کو برطانوی تاجر برطانوی کمپنیوں کے ذریعہ اپنی نوکریات میں بھیج دیتے ہیں۔

اس لئے ان کا کہنا تھا کہ غیر ملکی سرمایہ دراصل مقامی سرمایہ کو انہماک سے دور موڑ کر دے داکر اس سے روک رہا ہے۔ انہوں نے اس دلیل کو بھی رد کیا کہ ہندوستان کی باقیاتی ہوئی آبادی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ نہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ آبادی کا بڑھنا بھی اس وجہ سے ہے کہ ہندوستان برطانوی حکومت میں پس ماندہ ہو رہا ہے۔ اور اس کی ترقی رکی ہے ورنہ اہل ہندوستان نہ تو مست و کامل ہیں نہ شاہ خرچ ہیں۔ ورنہ کام چور ہیں ان وجوہات کی بناء پر قومی نقطہ نظر رکھنے والے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ہندوستان صرف ایک ذات پاتی طور پر ترقی کر سکتا ہے نہ صرف یہاں سب کو نمٹ ہوگی اور سیاسی طور پر ملے رہے اس کے پاس ہو گا۔

جن چند نے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ اگرچہ نوآبادیاتی نظام نے ہندوستان کو پس ماندہ رکھا مگر اس کے اقتصادی حربوں اور طریقوں کی وجہ سے ہندوستان میں قومی تحریک کی ابتداء ہوئی۔ اور خاص طور سے یورپی تعلیم یافتہ طبقے میں قوم پرستی کے جذبات پیدا ہوئے۔

پندرہویں قوم پرستی کی تحریک بھی مستند تھی اور اس میں کسی قسم کی انتہا پسندی اور شدت نہیں تھی۔ بلکہ یہ اس کے قائل تھے کہ برطانوی حکومت سے حقوق کی جو درجہ کی جائے وہ پرامن ہونی چاہئے۔ کیونکہ یہ درجہ صرف تعلیم یافتہ طبقوں میں محدود تھی۔ اس لئے ان کے مطالبات بھی ان کے عقائد مساوات کو خاطر کرتے تھے۔ اور یہ قسمی اس بات پر تیار نہیں تھے کہ اپنی تحریک میں عوام کو شریک کریں، کیونکہ ان کے گورنروں کے درمیان ایک گہری علیحدگی تھی۔ اور یہ خود کو تعلیم یافتہ 'دش خاں' اور سمجھدار سمجھتے تھے۔ جب کہ عوام ان کے نزدیک جاہل، بے خبر اور پس ماندہ تھے۔ اس وجہ سے اس وقت کی تحریکوں میں عوام کی شمولیت کا کوئی بھی خواہش مندر نہیں تھا۔ اور جن چند پال در ملک چھے لیڈر کہ جسوں نے انتہا پسندی کی تحریکیں چلائی۔ انہوں نے بھی نیچے

معتدل طبقوں سے اپیل کی اور عوام کو اپنی تحریکیں سے دور رکھا۔

ان ابتدائی قوم پرستوں کا یہ خیال تھا کہ صرف تعلیم یا دوسروں کو جھڑک کر اس حکومت پر دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ ان کے مطالبات کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس وجہ سے ان کی تحریک کا دائرہ تنگ تھا۔ اور وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ کوئی موثر تحریک چلا سکیں۔ انہیں اس ذہن میں نہ تو ہندوستانی زمینداروں سے اور نہ ہی سرمایہ داروں سے کسی قسم کی مالی امداد ملی۔

ہندوستان کی قومی تحریک میں عوام اس وقت آئے جب اس کی راہنمائی گاندھی نے سنبھالی۔ اس وقت سرمایہ داروں کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کانگریس کی مالی امداد کرے تاکہ یہ تحریک اس کے خلاف نہ ہو جائے۔ اور کانگریس کو بھی ان کی مالی امداد کی ضرورت تھی۔ کیونکہ ۱۹۳۱ء کے بعد سے کانگریس اپنے اراکین کی تعداد میں بے حد اضافہ کر چکی تھی۔ اس کے پاس اپنے کل رتنی رضاکار تھے۔ اور اسے انتظامات کرنے کے لئے 'اسٹریٹک' اور ایجنسی ٹیمیں کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ لیکن جہاں انہوں نے سرمایہ داروں سے مالی امداد لی تو اس کے ساتھ ہی وہ ان کے مفادات کا تحفظ کرنے لگے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چارے انتہا پسند ہوں یا معتدل یہ گاندھی ان میں سے کسی نے کسالیں اور عوام کے مسائل کو نہیں اٹھایا۔ اور صرف ان معاملات پر توجہ دی کہ جن کا تعلق سرمایہ داروں اور بورژوازیا سے تھا۔

لیکن چند دنوں نے ہندوستان کے سرمایہ دار طبقہ کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ طبقہ ہندوستان میں برطانوی سرمایہ دار سے مقابلہ کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس لئے یہ ان کا کماحقہ سہارا تھا۔ بلکہ ان سے مقابلہ کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر سرمایہ دار خاندان صدیوں سے پیداوار تھے۔ اس لئے ان کے دلوں میں برطانوی حکومت کے لئے عزت و احترام تھا۔ اور یہ اپنی دروز موہ کی زندگی اور کاروباری معمولات میں حکومت کے محتاج تھے۔ اس لئے جب حکومت ملک میں امن و امان پر دباؤ ڈالی اور مزدوروں کی اسٹریٹک کو ختم کر دی تو ان کے مفاد میں تھا۔ کہ قومی تحریک کو انداز کی شکل میں رکھیں اور اسے پورے دھنسنے دیں۔

اس لئے ان کی یہ کوشش رہی کہ قومی تحریک محدود رہے۔ وسیع و بعم نہ گمراہی ہو۔ اور اگر حکومت سے جدوجہد کی جائے تو یہ طویل نہ ہو۔ بلکہ جلد ہی کسی مفاد پر منتج جائے۔ عوام کو تحریک سے دور رکھا جائے۔ کہہ کر عوام کی شرکت تحریک کو پراکندہ کر دے۔

کی اور اس سے منفعی و معاشی ترقی متاثر ہوگی۔ اس لئے انہوں نے ہاتھ پاؤں کی جماعت کو آگے بڑھنے سے روکا۔ سرمایہ داروں کی خواہش یہ تھی کہ اگر برطانوی حکومت ختم ہو۔ تو یہ مخالفت اور مزاحمت کے ذریعہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ حکومت کو اس قدر مجبور کر دیا جائے کہ اسے جھکا پڑے۔ اس لئے حکومت سے صرف وہ مطالبات کرنے چاہئیں کہ جو وہ قبول کر سکیں۔ لیکن وجہ تھی کہ اس کے مطالبات وقت کو دیکھتے ہوئے کئے گئے۔ مثلاً ۱۹۳۰ء کی دہائی میں وہ کرلنی اور بیرونی کے مسئلہ میں مزاحمت چاہتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں یہ غی سیاسی حالت چاہتے تھے کہ جس میں یہ غیر ملکی سرمایہ پر پابندی لگا دیں۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے اقتدار کے جادو کی حمایت کر دی۔

معتدل پسندوں کی اس پالیسی کے خلاف پہلی جنگ عظیم کے بعد انتہا پسندوں کے پیسے گرم ہوئے۔ اور جہتیں ہیں جو مسائل و غلط بات چیت، 'معتدل' درمیان میں دیکھ نہیں چاہتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ یہ ایک طویل جدوجہد ہے کہ جس میں ہم لوہے کی نہیں لے گئے۔ اس لئے انہوں نے دہشت و تشدد کی پالیسی کو اختیار کرتے ہوئے کوشش کی کہ غیر ملکی حکومت کا تختہ مٹا دیا جائے۔ لیکن اس کی جلدی فکری یہ رہی کہ انہوں نے کوئی ایسی جماعت تشکیل نہیں دی کہ جس میں عوام کی شمولیت ہو اور اسی لئے یہ لوگوں کو اپنے ساتھ لانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان کی قربانوں سے مسلمانوں میں جو قومی جذبہ اور شعور پیدا ہوا۔ اس کا فائدہ بھی آگے چل کر کانگریس نے اٹھایا۔ اور اس کے ذریعہ اپنے بورژوا پروگرام کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

قومی تحریک کے آخر میں فرقہ واریت نے اس میں رخنہ ڈالنے کا ہنر چھوڑ دیا۔ کانگریس کے رہنماؤں پر تنقید کرتے ہوئے ان پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ انہوں نے فرقہ واریت کو روکنے کی کوئی ضروری جدوجہد نہیں کی۔ بلکہ طبقہ ملی کے مسلمانوں سے بات چیت کر کے کوشش کی کہ انہیں اپنے ساتھ لایا جائے۔ انہوں نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ مسلمان عوام کے مسائل اور ان کی ضروریات کو دیکھا جائے۔ وہ ان کے ساتھ دوطرفہ معاملے جاکیں۔ دوسرے کانگریس نے اپنے اندر فرقہ پرست اور انتہا پسندوں کو شامل کئے رکھا۔ اور ان کی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔

فرقہ واریت کے جذبات صرف اس وقت کم ہو جاتے تھے جب انگریزوں کے خلاف تحریک رہنماؤں پر ہوتی تھی جیسے مخالفت و عدم تعاون کے وقت یا سائمن کمیشن کے خلاف جب لوگ اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مگر جیسے ہی یہ انہی سہاروں کی تحریکیں ختم ہوتیں۔ فرقہ

دارت لن کی جگہ لے لی اور مذہبی اختلافات بھی جاتے۔ جن چندوں میں نتیجہ پہنچے ہیں کہ اگر فرقہ پرستی کے خلاف شہرہ ی سے موثر اقدامات کئے جائیں اور اس کی دہوات اور پھیلاؤ کو سمجھا جائے تو اسے ابتدائی دور میں روکا جاسکتا تھا۔

ماڈرن نظریہ میں فرقہ واریت

جن چندوں کی یہ کتاب کی عالم سے بڑی اہم ہے کیونکہ اس میں انہوں نے فرقہ واریت کی صرف تاریخ ہی نہیں دی ہے بلکہ یہ کن حالات میں پیدا ہوئی۔ اور کیوں کر ہندوستان میں فروغ ہوا اس پر فکری طور پر بحث کی ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق فرقہ واریت ہندوستان میں نہ تو تاریخی رشتہ و تعلق کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے۔ اور نہ یہ لوگوں میں موجود تھی۔ بلکہ یہ ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے بعد جو سیاسی معاشی اور سماجی تبدیلیاں ہوئیں ان کے نتیجہ میں پیدا ہوئی اور ہندوستان کی فرقہ واریت کوئی طبعی پسندوں کی تحریک نہیں تھی۔ کیونکہ اگر اس میں ایک طرف مسلمان میٹھی کی بات کرتے تھے تو دوسری طرف ہندو قوم پرستی کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں تھا بلکہ سیکر قوم پرستوں سے بھی تھا۔

ہندوستان میں چونکہ قومیت کی بنیاد نہیں تھی اور لوگوں کی شناخت کسی مذہب کے پیروکار کی وجہ سے ہوتی تھی اس لئے اس کی وجہ سے شناخت کی دوسری علامتیں رہ گئیں۔ اور مذہبی شناخت تو یہ ابھر کر آئی۔ اس شناخت کی وجہ سے ہندوستان میں فرقہ واریت کے جراثیم طائفہ ور ہوئے اور جب ان کا مقابلہ ہوا تو ہر مذہب نے اپنی تاریخ کا سارا لیتے ہوئے اسے اپنے ہیرو تخلیق کئے۔ اور تاریخ کو اپنے مفہم کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔

عام طور سے فرقہ ورہ۔ تحریکوں کی زبانی مڑنا اور طبقہ اعلیٰ کے افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ یہ ہے مسلمانوں کی کمیونٹی سے تعداد بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً جب یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کا طرز عمل میں کوئی مقرر کیا جائے یا کوئی پابندی اور سہولتوں میں ان کی پیشکشیں سمجھنے کی جائیں تو درحقیقت یہ مسلمان طبقہ یا مذہب کے مفہم سے مراد ہے۔ عام مسلمانوں کے نہیں مگر ان مطالبات کو اس طرح سے پیش کیا کہ یہ عام مسلمانوں کے مفہم ہوئے۔

نوآبادیاتی نظام میں چونکہ معاشی زندگی نہیں ہوتی تھی اور ملک معاشی طور پر پسماندہ تھا اس لئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے ملازمتوں کے مواقع محدود رہے۔ اس وقت بھی سب

سے زیادہ ملازمتی حکومت کے شعبوں میں ملتی تھیں۔ اور یہاں یہ حالت تھی کہ ۱۹۴۷ء کی دہائی تک اعلیٰ عہدوں پر صرف انگریزوں کو رکھا جاتا تھا۔ اس لئے حوصلہ عقد نے اپنی کمیونٹی کی بنیاد پر یہ مطالبات کئے کہ ملازمتوں میں ان کا کوئی مقرر کیا جائے۔ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑنے کی پتہ ہوئی۔

فرقہ واریت مساوات کی ایک اہم خصوصیت یہ رہی کہ اس میں اگرچہ میڈر شپ حوصلہ عقد کے پاس رہی مگر نقصان بیش غریب اور عام لوگوں کا ہوا۔ انہیں کے گھریلو جملے اور دینی نقل ہوتے تھے کہ اوپر کے لوگ ان جھگڑوں سے دور رہے اور صرف ان سے صرف فائدہ حاصل کئے۔

ہندوستان میں فرقہ واریت مختلف علاقوں میں علیحدہ علیحدہ دہوات کی بنا پر پیدا ہوئی۔ مثلاً ان علاقوں میں کہ جہاں مسلمان مسلمان و کاشت کار تھے اور ہندو زمیندار و جاگیردار وہاں مذہب کی بنیاد پر ظالم اور مظلوم کی شناخت کی گئی۔ جیسا کہ بنگال اور بھارتی مالدیپ میں مسیحیوں کے علاقے میں ہوا۔ مگر یہاں یہ صورت حال نہیں تھی وہاں دوسری دہوات کی تلاش کی گئی۔ مثلاً سندھ اور پنجاب میں مسلمان اور زمیندار دونوں مسلمان تھے۔ لہذا یہاں فرقہ واریت کے لئے ہندو بننے، مسلمان بننے اور مسودہ رہنے دینے والے چنے گئے۔ اور اس طرح مسلمان زمینداروں نے ایک طرف تو اپنے مظالم کو چھپایا کہ جو وہ اپنے کسانوں پر کرتے تھے دوسرے اس ذریعہ سے انہوں نے اپنے مساوات کا تحفظ کیا۔ اس طرف سے ہندو بنیں اور مسلمانوں نے اپنے مساوات کے لئے ہندو فرقہ واریت میں پناہ لی۔

اس لئے فرقہ واریت نے معاشرہ کو اور زیادہ پس ماندہ بنا دیا۔ ایک تو اس کی وجہ سے طبقاتی شعور پیدا نہیں ہوا۔ اور غریب و مظلوم عوام اپنے جائز حقوق کے لئے جدوجہد نہیں کر سکے دوسرے یہ سامراج کے خلاف نہیں ہوا۔ اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کے بجائے اس نے لوگوں کو آپس میں برسرِ پیکار رکھا۔ دوسرے بنیادی طور پر یہ جمہوری نظام اور روایات کے خلاف تھا۔ اس لئے فرقہ واریت کی وجہ سے برطانوی حکومت کو فائدہ ہوا۔

فرقہ واریت کے پیدا ہونے کی ایک اور وجہ ہندوستان میں قومیت کی کمی تھی۔ ابتدا میں قوم پرستی کے جذبات حوصلہ اور اپری طبقوں میں گئے کہ جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔ مگر نچلے طبقوں میں یہ جذبات اپنی جڑیں نہیں پکڑ سکے کیونکہ صرف اوپری طبقے اس کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ اس لئے نچلے طبقوں کے لئے مدد

مردم تہیں تھیں کہ با توہ، بائیں بازو کی تحریکوں میں شامل ہو جائیں اور با فرقہ واریت کی طرف سے جانیں۔ حکومت کی مخالفت کی وجہ سے کیونکہ بائیں بازو کی جماعتوں کو کام کرنے کی آزادی نہیں تھی اس لئے لوگوں کی اکثریت فرقہ پرستی کی طرف مائل ہو گئی۔

تیسری جماعتوں میں فرقہ واریت کی احساس کے ساتھ ہوئی ہے کہ اکثریتی جماعت ان کی تہذیب و ثقافت اور ان کی شناخت کو ختم کر دے گی۔ ہندوستان میں یہ احساس مسلمانوں کو ہوا۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے فرقہ واریت کے ذریعہ اپنی شناخت کو قائم رکھنا چاہا۔ ہندوؤں نے اس کے مقابلہ میں یہ دیکھ لیا کہ اگرچہ مسلمان ہندوستان میں قیامت میں ہیں مگر یہ دوسرے مسلمان ملکوں کے ساتھ مل کر سیاسی اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ ہند قوم لغویاً قوم مزاج اور امن پسند ہے اس لئے یہ ان پر اپنا تسلط قائم کر رہے تھے۔ اس لئے ہندوؤں کو اپنے تحفظ کے لئے طاقت، قوت اور عزم کی ضرورت

پانچ چھوٹے فرقہ واریت کے پیدا ہونے میں ہندو راہنماؤں پر تنقید کی ہے کہ یہ راہنما جو اگرچہ قومی راہنما تھے مگر ان کی قوم پرستی میں بھرست کے اثرات تھے۔ اور جب ہندوستان کی تاریخ کی بات کی جاتی تھی تو اس میں قسم ہندوستان کو توڑ دیا اور اجماع چاہا تھا۔ مگر مسلمانوں کی حکومت کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اس کی خدمت کی جاتی تھی۔ اسی طرح دیگر برہمنی کے طبقوں میں مسلمانوں کے خلاف مواد بھرا ہوا تھا اس رویہ نے مسلمانوں میں فرقہ واریت کے جذبات کو خوب بڑھایا۔

مسلمان میں فرقہ واریت ۱۹۳۸ء - ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں پھیلی۔ اور ابتداء میں یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کے مفادات خطرے میں ہیں۔ بعد میں اسلام خطرے میں ہے کہ نہ تو ہند کیا گیا اور اس طرح سے مذہب کی بنیادوں پر عوام کو ابھارا گیا اور اس سلسلہ میں مسلمانوں اور دیگروں کو سیاست میں لایا گیا۔ کیونکہ قومیت اور طبقاتی تقسیم کا شعور گمراہ نہیں تھا اس لئے مذہب کو موقع ملا کہ وہ لوگوں کے جذبات کو بھڑکائے۔

مسلمانوں میں اس لئے بھی فرقہ پرستی کی جڑیں جلدی گہری ہوئی کہ یہ بحیثیت جماعت کے پیچھے پس ماندہ تھے۔ اور ان میں اشیاء کی تحریکیں بہرہ پر پیدا ہو رہیں تھیں جن کی وجہ سے ان میں جدیدیت کے خلاف جذبات پائے جاتے تھے۔ نوآبادیاتی نظام نے ان کا تعلیمی و اقتصادی پس و پیش جس سے سب سے زیادہ امراء اور علماء متاثر ہوئے تھے۔ اور جدید تعلیم کے کم ہونے کی وجہ سے خود مدد کنہ دور قعداد میں کم تھا۔ اور اس کا رویہ ابھی سیکولر

میں تھا بلکہ مذہبی تھا۔ لہذا جن راہنماؤں کے پاس بھڑکاپ تھا ان کا تعلق جاگیردار طبقہ سے تھا۔ اور اس حیثیت سے یہ لوگ نوآبادیاتی نظام کے خلاف، نوآبادیاتی قومی تحریکوں سے دور تھے۔

جب کہ اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کا متوسط طبقہ اپنی سطح سے ابھر کر آیا تھا اور اس میں تھیں پرستی، سیکولرزم اور جدید رجحانات تھے۔ اسی لئے وہ قومی تحریکوں میں حصہ چڑھا کہ حصہ لے رہے تھے۔ اور اس کے ذریعہ وہ مزید مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

پانچ چھوٹے فرقہ واریت کے فروغ میں تاریخ کے استعمال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان تاریخی تحریکوں کا حوالہ دیا ہے کہ جن کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات بڑھے۔ بعد لڑنے پرستوں کا تاریخی نقطہ نظر یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان غیر ملکی ہیں۔ اس لئے ہندو قوم کا حصہ نہیں ہیں۔ ان کے ہزار سالہ دور حکومت میں ہندوؤں نے نصرت و شہادت کی ہے۔ اس لئے انہوں نے مسلمان دور حکومت کو اپنی تاریخ سے نکال کر اپنی عفت قدیم سہولتوں میں تلاش کیا۔ جس میں صرف ہندو تھے اور جہاں کسی قسم کا سادہ نہیں تھا۔ مسلمان مورخوں نے بھی ایک لحاظ سے اس نقطہ نظر کو تسلیم کیا اور یہ دیکھ لیا کہ ہندو اور مسلمان مذہبی و تمدنی لحاظ سے دو قومیں ہیں۔ اور ان کا مطالب بھی نہیں ہوا۔ اس لئے اب بھی یہ لڑ کر نہیں رہ سکتے ہیں۔

فرقہ واریت کے موضوع پر لکھے ہوئے اکثر مورخ مارا غلام برطانوی حکومت پر دیا دیتے ہیں کہ انہوں نے جوت ڈالو اور حکومت کر کے تحت ان دونوں میں اختلافات کو پیدا کیا۔ جس میں لڑایا۔ اور پھر آرام سے حکومت کی۔ پانچ چھوٹے فرقہ واریت کے تحت کرتے ہوئے یہ دیکھ لیا ہے کہ اس سلسلہ میں گھریلوں کو مورد الزام ٹھہرانا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ فرقہ واریت تاریخی سیاسی و سماجی حالات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ یہ ضرور ہوا کہ انگریزوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ انہوں نے قومی تحریکوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ کوشش کی کہ ہندوستانیوں میں قومی شعور کو روکا جائے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ برطانوی حکومت کو جب اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے موقع ملا اس نے ہندوؤں اور مسلمان فرقہ پرستوں کی سرپرستی کی۔ اور ان کے اختلافات سے فائدہ اٹھا۔

ہندوستان میں معاشی قوم پرستی کی نشوونما

پانچ چھوٹے فرقہ واریت کے بڑی تفصیل سے مندرجات کا تجزیہ کیا ہے کہ جن کی

وجہ سے ہندوستان کے تمام ذاتی طبقہ میں برطانوی حکومت کی معاشی پالیسیوں کی وجہ سے قوم پرست کا جذبہ ابھرتا شہور ہوا اور جیسے جیسے ان کی معلومات بڑھتی گئیں۔ اس طرح سے قوم پرستی کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی گئیں۔

جن چھوڑنے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ برطانوی اقتدار کے
 اپنی راند میں چپ کر اہل ہندوستان کو نوآبادیاتی نظام اور اس کی غرابوں سے راند
 واقفیت میں غمی تو انہوں نے اس نظام کے ان پہلوؤں کو دیکھا کہ جس کی وجہ سے معاشرہ
 میں بہت تبدیلیاں آئیں تھیں۔ مثلاً قانونی بالادستی اور امن و امان کا قائم ہونا چونکہ
 ہندوستان انھوں نے اور انیسویں صدی میں سیاسی انتشار اور انفراتری کے دور سے گزر رہا تھا۔
 اس لئے قانون کی بالادستی اور امن و امان نے معاشرہ کو بڑا سکون دیا اور اسی لئے انہوں
 نے نوآبادیاتی نظام کی تعریف کی۔ اس کے علاوہ آہستہ آہستہ مغربی تعلیم کے پھیلاؤ نے اہل
 ہندوستان میں ایک ایسے طبقہ کو پیدا کیا کہ جو جدید خیالات سے واقف ہوا اور اس تعلیم کے
 درجہ جیوری تعلیمات و خیالات ہندوستان کے معاشرہ میں آئے۔ اور روشنی خیالی کے
 جذبات پیدا ہوئے۔ اس لئے انہوں نے برطانوی حکومت کی تعریف کی۔

لیکن عہدہاء کے بعد ہندوستان کی یورپی تسلیم یافتہ کلاس کو نوآبادیاتی نظام اور اس کے معاشرتی استحصال کے بارے میں معلومات ہوئیں۔ اور یہ معلومات و آگاہی اس لئے ہوئیں کہ انہوں نے یورپی معاشریت کا مطالعہ کیا۔ اور اس نظام کے فلسفہ کو اس کے رعب سے سمجھا۔ اور پس اس نتیجہ پر پہنچے کہ نوآبادیاتی نظام ہندوستان کی معیشت کو نقصان پہنچ رہا ہے اور ہندوستانی معاشرے کی قریبوں کی جزس کا معاشرتی استحصال ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس بحث کی ابتداء کی ان میں ڈاڈا بھائی نورملی، ایم جی ریسٹوے، جی۔ وی جوشی، ارد۔ آر۔ سی۔ دت وغیرہ شامل تھے۔ انہوں نے خاص طور سے ہندوستان کی عورت کو موضوع بنا کر اس کا تجزیہ کرتا شروع کیا۔

اس سلسلے میں جو دیل دی جاتی تھی وہ یہ کہ ہندوستان کی غریت اس کی تادم میں ہے۔ یہاں پر پیش سے دولت کی غیر مادی تقسیم رہی اسی وجہ سے حرام پیشہ غریت اور مفلس رہے اور مشکل سے زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کیں جبکہ قوم پرست طبقہ کی ریل یہ تھی کہ اس غریت کی وجہ برطانوی حکومت ہے جو ہندوستان کی دولت اور ذرائع کی لوٹ کھسوٹ کر رہی ہے اور لوگوں کو ان کی ضروریات سے محروم کر رہی ہے۔ برطانوی حکومت کا کہنا یہ تھا کہ غریت کی ایک وجہ آبادی کا مسلسل بڑھنا ہے۔ جس کی وجہ سے

[illegible][illegible]

اس موقع پر معاشیات اور سیاست دونوں اس طرح سے اکٹھے ہوئے کہ قوم پرستیوں نے یہ تحریک چلائی کہ میری فکری شاید کامیاب نہ کی جائے اور اس کی جگہ ہندوستانی جمہوریت کو استعمال کیا جائے۔ لیکن چھ ماہ بعد کی مرحلہ میں یہ تحریک نیا دھماکا بن کر ابھری اور اس نے قوم پرستی کے اس وقت قوم پرستی کے جذبات اس قدر گہرے نہیں تھے۔

جسبہ ہندوستان میں رابطے کا ایسی ہیچائی ممکن ہے کہ اس کے فوائد ہر حکمران نے بڑا

پر دیکھا گیا۔ لیکن قوم پرست میڈر شپ نے اس کی بھی سخت مخالفت کی اور اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی صنعتیں تباہ ہو گئیں۔ اور اس نے سرحد کو ہندوستان سے باہر نکالنے میں مدد دی۔ اس کے علاوہ اس نے اناج کی درآمد کو بھیجا دیا ہے اور ملک میں اس کی وجہ سے قحط کے خطرے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے ریلوے نے دیہاتی ذرائع کے ٹوٹ کھوٹ میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

حکومت ریلوے کی وجہ سے ہندوستان کی معیشت میں زبردست تبدیلیاں آئیں ان میں سب سے پہلے کر یہ کہ اس نے ایک کمرشل انقلاب کو پیدا کیا۔ اور اس کی وجہ سے مختلف علاقوں میں آپ و ہوا کی وجہ سے ایسی لہلوں پر توجہ دی جانے لگی کہ جس سے تجارتی طور پر کشتیوں کو ٹائم ہو، دوسرا اثر یہ ہوا کہ پورے ملک میں چونکہ ملان ٹری سے آئے جانے لگا اس لئے چیزوں کی قیمتیں ہر علاقہ میں یکساں ہو گئیں۔ اور ریلوے کی وجہ سے ہندوستانی تاجروں کو یہ موقع ملا کہ انہوں نے دیہاتی علاقوں میں بھی سرمایہ کاری شروع کر دی۔ مگر قوم پرست راہنماؤں نے اس کے حق پرلوں کو دیکھا اور ان کو اچا کر کیا۔

مگر جس مسئلہ پر قوم پرست میڈر شپ کی کنٹروی کس کر سامنے آئی وہ اس کا بلدیاتی کردار ابھر کر آیا وہ صنعتی مزدوروں کے مسائل تھے۔ اگرچہ اس ابتدائی دور میں مزدوروں کی تعداد کم تھی۔ مگر ٹیکسٹائل، کانوں، کھیتوں، درناں پورٹ میں مزدوروں کی خاصی تعداد تھی۔ اور ان مزدوروں کا کام کا حامل تنہا خرابیہ اور ذلت ناک تھا۔ یہ کامیوں سے ٹیکر افادہ کمٹیوں تک کام کرتے تھے۔ سال میں صرف ۵۰ چھٹیوں ملتی تھیں۔ مرن و بچوں کی حالت اور بھی خراب تھی کیونکہ اسیں اپنی مدت کی مزدوری کی تنخواہ اور بھی کم ملتی تھی۔ اس لئے جب حکومت کی جانب سے ان مزدوروں کی اصلاحات کے لئے مختلف ایکٹ بنائے گئے تو اس کی مخالفت قوم پرست میڈر شپ نے کی۔ کیونکہ ان ٹیکسٹائل کے اکثر مالک ہندوستانی تھے۔ اس لئے ان کی مزدوروں سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کے ساتھ تھیں اور وہ طویل کام کے اوقات، بچوں کی مزدوری، کم تنخواہ اور کم چھٹیاں ان سب کو جانتے قرار دیتے تھے۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے تھے کہ ہندوستان کو صنعتی ملک بنانے اور انگلستان کی صنعت سے مقابلہ کرنے کے لئے مزدوروں کو قربانی دینی چاہئے۔

چنانچہ دادا بھائی نورانی، بی۔ وی۔ جوشی اور آر۔ سی۔ وید جو ہندوستانی عہد پر دیتے تھے۔ اور جو آج پڑی معاشری استحصال کے خلاف لکھتے تھے۔ انہوں نے مزدوروں کی

حالت دار "غربت" اور ان کے مسائل پر ایک لفظ نہیں لکھا۔ اور نہ مشورہ دیا کہ کسے نے ان کے مسائل پر کچھ کہا۔ اور نہ ہی کانگریس نے ان کی بد حالی میں کوئی مداخلت منظور کیا۔ انہوں نے صرف ان وقت مزدوروں کے لئے اور انہیں جب وہ برطانوی سرمایہ داروں کی ملازمت میں رہے جیسے آسام کے کئی، مگر جب ہندوستانی سرمایہ داروں نے ان کا استحصال کیا تو وہ بالکل خاموش رہے۔

یہی صورت حال درخت کی تھی۔ کہ قوم پرست راہنماؤں نے حکومت کی ذریعہ پالیسیوں پر تو کبھی چٹنی کی، اور نگران کی زبانی کو کسانوں کی عہد کی وجہ قرار دیا مگر انہوں نے ہندوستانی زمینداروں کے استحصال کو راز پر کچھ نہیں کہا، اور دیہات میں ساہوکار کے ظلم پر بھی خاموش رہے کہ ہندو کسانوں کو سود پر دہیہ دے کر اس سے ساری زمین کی سود وصول کرتے تھے۔

اسیوں نے اپنی تنقید کا شیڈ صرف برطانوی حکومت اور لوہاؤں نظام کو بنایا۔ حکومت کی ٹیکس کی پالیسی پر احتجاج کیا۔ فوجی اثرات کی زیادتی پر شور مچایا اور حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا کہ وہ تعلیم، صحت اور لوگوں کی علاج، ریلوے پر خرچ نہیں کرتی ہے۔ انہوں نے اس پر بھی آواز بلند کی کہ ہندوستانی مذہب کی طریقوں سے انگلستان ۲ ماہ ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہندوستان کی معیشت تباہ ہو رہی ہے اور سرمایہ کی یہ منگلی ایک مستقل لچر ہے جو ملک کو نکال کر دے گا۔

اپنی تمام کنٹرویوں کے باوجود ہندوستانی معیشت والوں اور راہنماؤں نے جن اقتصادی مسائل کو اٹھایا، اور آزادی کی ٹوٹ کھوٹ کو ظاہر کیا اس نے قومیت کی تحریک کو تیز کر دیا۔ اور بال ہندوستان میں اس خیال کو تقویت دی کہ صرف آزادی کی صورت میں اور تو تباہی کا کام کے خاتمہ کے بعد ہی وہ ہندوستان کے ذرائع اور اس کی دولت کو ملک کی ذاتی کے لئے استعمال کر سکیں گے اور یہی وہ بنیاد تھی جس پر ملک کی آزادی کی بنیاد پڑی۔

فرقہ واریت برطانوی عہد میں

”کیا تندر پٹھے“ ہندوستان کے ان جدید مورخوں میں سے ہیں کہ جن کو ان تحریکوں، نظریات اور تاثرات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ جو نوآبادیت اس کے نظام اور اس دور کی لکھی ہوئی تاریخ کی وجہ سے ہوئے۔ نوآبادیاتی دور کی تاریخ ویسی لے کر ذہن بنایا ہے اس سے ہندوستانی معاشرہ اور اس کی ماضیت کے بارے میں بہت سی غلط سمجھیں اور تصورات پیدا ہو گئے ہیں کہ جن کا شمار ہندوستان کا موجودہ سماج ہے۔ ان تصورات کا خاتمہ اسی وقت ہو گا جب تاریخ کو نوآبادیاتی دور کے نظریات سے آزاد کر دیا جائے گا۔

اگرچہ ہندوستان میں مختلف مذاہب، ذاتوں، برادریوں اور قوموں کے لوگ آباد تھے اور ان میں مذہبی اختلافات سے بے کر لسانی اور ثقافتی فرق موجود تھے مگر فرقہ واریت کی ابتداء ہندوستان میں انگریزی قدر کے قائم ہونے کے بعد سے ہوئی، دورہ اس سے پہلے مختلف فرقوں میں اپنی شناخت کو تسلیم کرانے کے لئے جارحانہ انداز نہیں تھا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے کیوٹی کا لفظ اسی دور میں استعمال ہوا شروع ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نسل کا لفظ خاص پڑو وکیل اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور قوم یا عرب میں ”قومی ریاست“ میں رہنے والوں کے لئے تھی، جبکہ ہندوستان ایک قومی ریاست نہیں تھی اس لئے یہاں کے لوگوں کے لئے کیوٹی کا استعمال ہوا۔ ڈیچ۔ سی۔ اسٹرن نے ”مذہب اسلام ان انڈیا“ میں اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کیوٹی سے مراد لوگوں کی ایک ایسی جماعت ہے جن کا تعلق ایک مذہب سے ہو اور جن میں سماجی، سیاسی اور معاشی قدریں مشترک ہوں، دو دوسری جماعتوں سے ان جماعتوں پر اختلاف رکھتے ہوں۔ جن چہرے نے اپنی کتاب ”کیوٹی“ میں ان باتوں کو ”مذہب“ میں س کے بارے میں لکھا ہے کہ کیوٹی ازم میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کا تعلق ایک مذہب سے ہے۔ ان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مفادات بھی ایک ہیں۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء کی دہائیوں میں کیوٹی ازم کی اصطلاح اس خاص محفل میں استعمال ہونے لگی اور اسے ہندوستان کے قوم پرستوں نے بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً ۱۹۱۸ء میں سوامی راج رت میں کہا گیا کہ ”فرقہ واریت بنیادی طور پر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کا نام ہے“ اس لئے اس دور میں فرقہ واریت، قوم پرستی کی تحریک کے لئے ایک خطرناک اور فرقہ واریت کا سبیل سیاست کا ایک اہم مسئلہ بن کر رہ گیا

میں کی طرف برطانوی حکومت اور قوم پرستوں دونوں نے توجہ دی۔

برطانوی حکومت کا نقطہ نظر یہ تھا کہ فرقہ واریت کی جڑیں ہندوستان کی تاریخ میں پوسٹ ہیں۔ اس لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ تاریخی عمل کی پیداوار ہے۔ اس کے برعکس قوم پرستوں کی دلیل یہ تھی کہ فرقہ واریت نوآبادیاتی نظام کے قائم ہونے کے بعد سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے لہذا یہ اسی وقت دور ہو گی کہ جب نوآبادیاتی نظام کی فراموشیاں ختم ہوں گی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس بات کی بھی نشان دہی کی کہ نوآبادیاتی دور میں ہندو اور مسلمانوں کے اختلافات کو خالص طور سے تاریخ کے ذریعہ ابھرا گیا ہے اور تاریخ کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن نظر آئیں۔ کیونکہ اس کے ذریعہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اہل ہندوستان آپس میں لڑتے رہتے تھے، ان میں مذہبی و سیاسی و سماجی اختلافات تھے اور یہ صرف برطانوی حکومت ہے کہ جو ان میں خانہ جنگی کو روکے ہوئے ہے اس لئے سکا قائم رہتا ہندوستان کے مفاد میں ہے۔

مثلاً ہندوستان میں فرقہ واریت فسادات کی ابتداء انیسویں صدی کے ابتدائی دور سے شروع ہوئی اور ان فسادات کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں جبرہوں نے جبرہ جبرہ کر رکھا تھا۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر جبرہ کیوں اس قدر متغصب ہو گئے اور کیوں وہ فسادات میں شریک ہوئے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے پٹھے نے اس صنعتی عمل کی جانب اشارہ کیا ہے کہ جس کی وجہ سے جبرہ متاثر ہوئے۔ نئی سائنسی اور تکنیکی ترقی اور انگلستان میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ان کی کپڑے کی صنعت کے فروغ نے ہندوستان میں کپڑے کی صنعت پر اثر ڈالا جس کے نتیجے میں جبرہ اپنا تباہی پیشہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ بے روزگاری کی وجہ سے ان میں اکثر کو مزدوری سے لے کر نچلے درجے کے کام کرنا پڑے۔ اس لئے ان کی ذات و عزت و خوار کا شمار ہوئی۔ انہیں اپنے جس پیشہ پر فخر تھا اور جو ان کے لئے شناخت تھا۔ اس سے محرومی تھی ان کی زندگی میں غلامی پیدا کر دیا اور اس حالت میں انہیں اپنے مگر رہے ہوئے اچھے دن یاد آتے تھے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ جبرہوں کی اکثریت مثلاً ہندوستان میں مسلمانوں کی تھی اور کاروبار میں ان کا واحد ہندو دلالوں اور سامانداروں سے رہتا تھا جو کہ انہیں سود پر دیکھتے دیکھتے تھے۔ سماجی تبدیلی کی اس صورت حال سے زیادہ فائدہ ہندوؤں کے ان دونوں طبقوں کو ہوا، جبکہ جبرہوں کو نقصان ہی نقصان ہوا اسی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی محرموں کے

نتیجہ میں مذہب میں پناہ لی اور مذہبی بنیادوں پر انہوں نے ہندو ساہوکاروں کے خلاف فتوے جاری کیے۔ ان دنوں ہندو میں مذہبی تشدد اس لئے آگے بڑھا کہ سماجی اور معاشی غرو میں کے نتیجہ میں مذہبی عداوت "مذہبی دہشت گردی" اور پرہیز گاری کا اظہار معاشرہ میں باعث حربہ بن گیا۔ اسی لئے جھگڑوں اور لڑائیوں میں دونوں جانب سے مذہبی علامات و نشانات کو اختیار کیا گیا۔

نیمویں صدی میں ذات پات کی مختلف تحریکیں شروع ہوئیں جس کی وجہ سے عیسوی عیسائی کمیونٹی میں اپنی شناخت کی جڑیں تلاش کرنے اور خود کو دوسروں سے ممتاز کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس عمل کو پیدا کرنے میں نوآبادیاتی نظام اور اس کی اصلاحات کا بڑا دخل تھا۔ مثلاً ۱۸۵۷ء کی مردم شماری میں حکومت نے اس پات پر زور دیا کہ ہر شخص اپنی ذات اور کمیونٹی کو رجسٹر کرائے۔ اسلئے تبدیلی ہوتے ہوئے سماجی حالات میں ہر ذات کی یہ کوشش ہوئی کہ وہ معاشرہ میں باعزت مقام حاصل کرنے کے لئے خود کو اعلیٰ درجہ پر ثابت کرے چنانچہ ۱۸۸۱ء اور ۱۸۹۱ء کے درمیان مسلمان راجپوتوں نے خود کو حق کنوانا شروع کر دیا جب کہ دوسری بنگالی ذاتیں جن میں جولہے "بنگالی" اور بنگالی وغیرہ تھے یہ شیخ بن گئے۔ اگرچہ جو اوچھی کلاس کے مسلمان تھے انہوں نے ان دونوں کو تسلیم نہیں کیا۔

ذاتوں کو پیدا کرنے کا یہ سلسلہ مسلمانوں میں ہی نہیں تھا بلکہ ہندوؤں میں بھی یہ عمل جاری تھا۔ ان میں چار ذات کے لوگوں نے خود کو ست نامی (سچے دیوتا) کہا اور اسیوں در در میں نے بھی اپنی ذاتوں کو بلند کیا۔ اپنے اس بلند درجوں کے بعد ان ذاتوں نے بیکار کرنا بند کر دیا اور اپنی عورتوں کو کھڑوں میں دیکھنے لگے۔ نہیں صرف پردہ میں رکھنا ہی مقصد نہیں تھا۔ بلکہ یہ تھا کہ اوچھی ذات کے لوگوں سے ان کی عزت محفوظ رکھی جائے۔

اس کے بعد ان یعنی بھون کیونٹیلوں میں امدادی تحریکیں شروع ہوئی اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے یہ نہیں حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنی اپنی جماعتیں بنائیں۔ اور اپنی ذات کی اہمیت و شناخت کی خاطر ان میں مذہبی احیاء کی تحریکیں اٹھیں۔ مثلاً جودھوں نے جو کہ نو مسلم تھے اس لحاظ سے مسلمانوں کے طبقہ اشراف میں ان کی عزت نہیں تھی۔ لہذا انہوں نے خود کو سچا اور پاک و خالص مسلمان بنانے کے لئے اپنے ہاں سے ان دہشت گرد ختم کرنا شروع کیا جو ہندوؤں کی تھیں تاکہ مسلمان اشراف طبقہ میں شامل ہو سکیں۔ انہوں نے خالص مسلمان نام اختیار کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ ثابت کیا کہ ان کے تاجدار اجداد دراصل عرب سے آئے تھے اور اسی لئے ۱۸۸۱ء کی مردم شماری میں انہوں نے

خود کو حرمی اور انصاری کے نام سے رجسٹر کرایا۔

اور ہندوؤں میں جن ذاتوں نے خود کو ہندو کرنا چاہا تھا۔ ان میں خالص ہندو دہشت گردانہ چار ہوا اس طرح دونوں طرف سے آپہ کی تحریکیں نے ان میں مذہبی عداوت کو پیدا کیا۔ اس لئے ایک طرف جب جولہے بقرمید پر گائے کی قربانی کو مذہبی فرض سمجھتے تھے تو امیر جسوں نے گوالہ تحریک شہر کی قیادت کی وہ گائے کی حفاظت اپنا مذہبی فریضہ گردانتے تھے لہذا دونوں اس مسئلہ پر کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں تھے اور یہ وہ مسائل تھے جو آگے چل کر فرقہ پرستی کی بنیاد بنے۔

ذات اور کمیونٹی کی شناخت کے ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی گئی کہ تاریخ کے زریعہ سے مقام حاصل کریں اس لئے مختلف کمیونٹوں نے اپنی اپنی تاریخ لکھنے شروع کی۔ مثلاً ۱۸۵۷ء کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کی ذات کا شمار اوچھی ذاتوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ کھتری کستری بن گئے اور کورمیر نے یہ دعویٰ کیا کہ بن کا تعلق کورما سے ہے جو کہ دشو کا ایک روپ ہے چاروں نے اپنا اپنا تعلق برہمنوں سے نکالا تو لونا (تک بٹنے والے) ذات نے اپنا رشتہ پر قہوری راج چھان سے قائم کر لیا۔ اس رجحان کے بارے میں ۱۸۷۱ء کی دہائی میں ایک مصنف بھارت تہذیب لکھا ہے کہ:

تلف ذاتوں کے لوگ اپنی تاریخ کی تشکیل دینے میں مصروف ہیں۔ مثلاً دھرم (Dharma) جن کی دیشینو ذات کے بارے میں بھی شبہ ہے کیونکہ وہ چوہ کی شادی کی اجازت دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ برہمن ہیں۔ کاپتہ لوگوں نے (جو کہ شور ذات سے ہیں) کستری ہونے کا دعویٰ کر دیا اور چانوں کا بھی۔ کہا ہے کہ وہ کستری ہیں۔ اسی طرح سے تاریخ ان ذاتوں کے لئے وہ ذریعہ بن گئی کہ جس کے ذریعہ انہوں نے اپنی شناخت کو مضبوط بنایا۔ اور اس کے بعد جب ان کا درجہ بلند ہو گیا تو انہوں نے اپنے حقوق کی بات کی۔

اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ہندو اور مسلمان بنگالی ذاتوں نے خود کا تعلق امریکی اور اشراف کی ذاتوں سے کرنا چاہا تو اس پر ان دونوں ذاتوں کے لوگوں نے طم و غصہ کا اظہار کیا، اور اکثر ان کا مذاق بھی اڑایا۔ مثلاً بولائے کہ جن کا سماجی مرتبہ کم تر تھا۔ سوارک پور میں جو کہ بونہی کا ایک شریف تھا۔ ان کی علیحدہ مسجد تھی۔ وہ شہر کی جامعہ مسجد میں نماز تو پڑھ سکتے تھے مگر انہیں اجازت نہیں تھی کہ اگلی صف میں بیٹھیں۔ سوڈنا اشراف علی قانوی نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ "مگر کوئی جولاہا دو دن نماز پڑھ لے تو وہ یہ سمجھتا

شرع کر دیتا ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر ہندو میں سے ہے۔ اس لئے اپنی ذات والوں نے اس پر اعتراض کیا اور کوشش کی کہ اپنی ذات و ہوں کی اپنی تاریخ نہ ہو۔

ہندوستان کی تاریخ میں ایسی طور پر اس وقت تبدیلیوں کا شروع ہوا جس کا جب برطانوی حکومت نے نمائندہ اور ان کے قائم کرنا شروع کیا اور تمام کی حاصل کرنے کے لئے سیاسی و انتظامی کے کیونٹی کے جذبہ کو ابھارا۔ مثلاً سیاسی وادی کی تاریخ پر اسی صدی میں پہلی مرتبہ اچھوت لوگوں کو ہندو شمار کیا گیا۔ اور بعد میں اسی بنیادوں پر ہندو اور مسلمان علیحدہ علیحدہ کیونٹی بنیں۔ ۱۹۲۰ اور ۱۹۳۰ کی دہائیوں سے پہلے ہندوستان میں قومیت کا تصور یہ تھا کہ ہند پر مسلمان، ہندو، سکھ، اور پارسی قومیں ہیں۔ اور کسی ایک ہندوستان قوم کا وجود نہیں تھیں اس کے بعد ہندوستانی قوم کا نظریہ پیدا ہوا شروع ہوا۔ اور اس بات پر غور کیا گیا کہ جو بھی ہندوستان میں رہتا ہے وہ ایک ہی تفریق کے دو ہندوستانی ہے اس لئے تاریخ کو قومی نقطہ نظر سے پیش کرتے ہوئے ان حکمرانوں کو ابھارا گیا کہ جنہوں نے ہندوستان کو متحد کیا تھا۔ ان میں اشوک، اکبر وغیرہ شامل تھے۔ اور یہ اس تاریخ کی "روایت ملی" کہ اس نے اتحاد کی وجہ کو مل "راجپوت" اور بدھ مت حکمرانوں کو قرار دیا۔ اور لوگ یا غورم جو کہ تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ان کی خوشامیث، منصوبوں اور عوام کو نظر انداز کر دیا گیا اور نہ ہی ان کی مقامی وفاداریوں کو اہمیت دی گئی۔ اس طرح سے ہندوستانی معاشرہ میں جو قوم پرستی آئی اسے "وہ" سے غائب کیا گیا اور تاریخ کو قومی بنا کر اسے صرف ریاست کی تاریخ کا درجہ دیا گیا۔

نو آبادی دور میں سمرانی سرحدوں کا نقطہ نظریہ تھا کہ یہ صرف مہاشوا میں امن و امان برقرار رکھ سکتی ہے۔ مذہبی اختلافات کو ختم کر سکتی ہے۔ اور ہندوستان کو جدید دور میں داخل کر سکتی ہے۔ قوم پرستوں سرحدوں نے بھی ریاست کی اہمیت پر غور کیا کہ صرف ریاست کے ذریعہ ماضی میں ہندوستان کا اتحاد قائم ہوا۔ اور مستقبل میں بھی ریاست ہی اس اتحاد کو برقرار رکھے گی۔ اس سے سیاسی و انتظامی کا درجہ بلند ہو گیا۔ اور جس طرح ماضی میں اشوک اور مہر نے لوگوں کی پس ماندگی دور کی تھی۔ اب یہ کام "ہندو" قبائل اور دوسرے رہنماؤں کا ہو گا کہ وہ لوگوں کو پس ماندگی سے نکالیں۔ اس طرح سے لوگوں کی اپنی اہمیت قائم ہو کر رہ گئی۔

موہا بغاوت

کسی بھی سرحد کے لئے یہ بہت مشکل ہوتا ہے کہ وہ ہم سرحدوں کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ صادر کرے۔ کیونکہ اس وقت بہت سے حقائق نظریوں سے اور ہم ہوتے ہیں اور بہت قریب ہونے کی وجہ سے واقعات کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات جذبات کی بنیاد پر کوئی رائے دی جاتی ہے۔ مگر کچھ ہندوستان میں ہونے والی موہا بغاوت کے ساتھ ہو "جنوں نے ۱۹۳۱ اور ۱۹۳۲ میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی" بہت سے جمعہ لکھنے والوں کی نظر میں یہ بغاوت دراصل مسلمان اور ہندوؤں کے درمیان فرقہ وارانہ جنگ تھی جس میں کہ ہالی مہادوں نے ہندوؤں پر مظالم ڈھائے اور اس طرح اس جگہ سے ہندوستان میں اس وقت کے ہندو مسلم اتحاد پر کاری ضرب لگائی۔

اب جبکہ اس واقعہ کو گزشتہ ہونے ستر سال گزر چکے ہیں تو اس دوران میں بہت سے حقائق، حکومت کی رپورٹیں، "بیانات" "اعلامات" اور لوگوں کے انگریزوں کے مذہب سے "تہ ہیں" اور اس نے ایک برطانوی نقطہ نظر اور "وہ" سے موہا بغاوت دور اس کی وجوہات پر کتاب لکھی ہے تاکہ حقائق کو معروضی انداز میں تجزیہ کر کے بغاوت کی صحیح صورت پیش کی جائے۔

اس نے تاریخی طور پر جنوبی ہند میں کہ جہاں موہا کہا "ہیں" ان کے اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ۱۹۳۱ اور ۱۹۳۲ کی بغاوت کو فرقہ واریت کی جنگ کہنا غلطی ہے کیونکہ وہ حقیقت اس کی بڑی مدد میں نہیں تھیں بلکہ ان کا تعلق سماجی و نسلی حالات سے تھا اور جب یہ سمجھا شروع ہوا تو اس نے بغاوت کی شکل اختیار کی تو ہندوؤں نے مذہب کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تاکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو بغاوت پر ابھارا جائے اور ایک طرف برطانوی امپیریل ازم اور دوسری طرف ہندو زمیندار سے لڑا جائے۔

کورڈو نے موہاؤں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ یہ مقامی لوگ تھے جو مسلمان ہونے اور ان کی مادہ پار میں آبادی ۳۲ فیصد تھی ان کی ادنی زبان میلم تھی اور پیش کے اعتبار سے یہ کسان تھے۔ ان کے علاقہ پر تاریخ میں مختلف ہندو راجاؤں نے حکومت کی مگر بغیر قومی طور پر یہ علاقے میسور کی ریاست کے ہند

میں آگئے اور حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے ان پر حکومت کی۔ اس زمانہ میں مہلاؤں کے مہلاؤں کو یہ مواقع ملے کہ وہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنائیں۔ اور اپنا سماجی رتبہ بلند کریں اور ساتھ میں ہندو زمیندار جو کہ جنسی کلاتے تھے ان کے استحصال سے خود کو آزاد کریں۔ جنسی بدعنوانی نے ٹیپو سلطان کے دور حکومت میں کہ جب رتا پر دیا ہوا تھا انہوں نے اپنی زمینیں چھوڑ دیں اور ہمسایہ علاقوں میں ہجرت کر کے چلے گئے۔ جب ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کو شکست ہوئی تو یہ جنسی زمیندار دوبارہ سے جنگی اہلکار میں چلے آئے اور اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کی مدد کی تاکہ وہ اپنی چھوڑی ہوئی زمینوں پر دوبارہ سے قابض ہو سکیں۔ اس پالیسی کے خلاف مہلاؤں نے ۱۸۰۰ء اور ۱۸۰۳ء میں بغاوت کی۔

اس طرح سے مہلاؤں کی بغاوت کی ابتدا ۱۸۰۰ء میں اس وقت سے ہوئی ہے کہ ۱۸۰۱ء ایسٹ انڈیا کمپنی ان علاقوں میں اپنے اقتدار کو مستحکم کر رہی تھی اور اس وقت سے وہ انگریزی حکومت کو اپنے حقوق کے خلاف سمجھنے لگے تھے اس لئے کمپنی کی سیاسی طاقت اور ہندو زمیندار کی معاشی طاقت، استحصال کے خلاف ان کی مزاحمت شروع ہوئی۔

برطانوی انتظامیہ اور اس کے افسروں نے مہلاؤں کے اس فالگنڈ رویہ کی وجہ سے ان کے بارے میں جو رائے قائم کی وہ یہ تھی کہ "مہلا بدترین قوم ہے"۔ "برطانوی حکومت کی سخت مخالف ہے"۔ ان پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے بعد "مہلا اتنا پندری" کی اصطلاح ان کے لئے نکلتی سے استعمال ہونے لگی اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان اقوام یا جماعتوں اور گروہوں نے کہ جنہوں نے انگریزوں سے تعاون نہیں کیا، جنس انگریزوں نے اپنے بدترین دشمنوں کی حیثیت سے پیش کیا اور ان کی مزاحمت کو سختی سے پکڑا۔ ان کی جانب سے ایسی بہت کم کوششیں ہوئیں کہ ان کے مسائل کو سمجھا جائے اور ان کا کوئی حل تلاش کیا جائے۔

اس وجہ سے مہلاؤں نے بار بار بغاوتیں کیں ان میں ۱۸۳۴ء اور ۱۸۳۹ء کی بغاوتیں مشہور ہیں۔ ان میں سب بغاوتوں میں سب سے بڑا ۱۸۵۷ء مشہور اور اہم بغاوت ۱۸۵۷ء کی تھی۔ یہ بغاوت اس وقت شروع ہوئی جب کہ ہندوستان میں خلاف تحریک اور تحریک عدم تعاون جاری تھیں اور ان دونوں تحریکوں میں ہندو مسلمان متحد ہو رہے تھے اس لئے مہلاؤں میں اس قسم کی افواہیں پھیلنا شروع ہو گئیں کہ غیر ملکی حکومت فتنہ برپا کر رہی ہے۔ اس نے ایسی یہ حوصلہ دیا کہ حکومت کے بغاوت کر کے اپنی حکومت قائم کریں۔ دیکھا جائے تو برطانوی دور حکومت میں ۱۸۵۷ء کے بعد یہ سب سے زیادہ خطرناک بغاوت

تھی کہ جس نے برطانوی حکومت کو ہار کر رکھ دیا۔ اور حکومت کو اپنی پوری قوت اس کی طرف کرنی پڑی تاکہ اس کو ختم کر کے دوبارہ سے حکومت کی سادھ کو بحال کیا جاسکے۔

ان تمام بغاوتوں میں کہ وہ مہلاؤں نے کیں ان میں مذہب نے ایک اہم کردار دیا کیلئے کیونکہ یہ بغاوتیں بنیادی طور پر مسلمان کسانوں اور ہندو زمینداروں کے درمیان ہوئیں۔ اس کے علاوہ یہی طور پر یہ فرقہ واریت کی شکل اختیار کرتے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان بغاوتوں کے دوران مہلاؤں نے تبلیغ بھی کی اور ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی کوششیں کیں۔ اس لئے یہ خیال تھا کہ ان کی بغاوتوں پر مذہب کا مطلب ہے۔ لیکن اگر ان بغاوتوں کا محرک اس سے متعلقہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مہلا معاشی اور سماجی استحصال کے خلاف مذہب کو بطور ایک آلہ اور ہتھیار کے استعمال کر رہے تھے اور وہ اس پر اس لئے مجبور تھے کہ اس وقت ان کے سامنے کوئی سیکور اور قومی طور پر موجود نہیں تھا کہ جس کو وہ اختیار کر کے لوگوں کو متحدہ کرتے۔ جب کہ مہلاؤں کی اکثریت ان پندہ تھی اور مذہب کے بارے میں ان کی معلومات بہت کم اور سطحی تھیں۔ مگر بغاوتوں کو اخلاقی بواز قریب کرنے کے لئے مذہب کا استعمال ہوا اور مذہبی علامات کو بھی اختیار کیا گیا۔ مثلاً کفن پہن کر جنگ کے لئے جانا تاکہ مرنے کے بعد شہید کا درجہ حاصل کیا جاسکے۔ اللہ اکبر کے نعرے لگانا تاکہ لوگوں کے لئے حوصلہ ہو۔

جب بغاوت کے دوران وہ تبلیغ کرتے اور لوگوں کو مسلمان بنانے کی کوشش کرتے تو ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ حکومت غیر مسلموں کو ان کے خلاف استعمال نہ کر سکے اور سب ایک مذہب کو اختیار کر کے متحد ہو جائیں۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ مسلمان جو کہ حکومت کے ساتھ تعاون کر رہے تھے جب وہ پکڑے جاتے تو باقی ان کو مارنے مارنے سے گھر چھوڑ کر اسیں دوبارہ سے اپنی امداد میں شامل کر لیتے تھے۔

اس لئے جیساں طور پر یہ بغاوتیں مذہبی نہیں تھیں ان کی تحریک میں بہت سے غریب ہندو بھی تھے کہ جنہوں نے ہندو جاگیرداروں کی جائیدادوں کی لوٹ میں حصہ لیا۔ جب کہ بہت سے مسلمان تھے کہ جنہوں نے حکومت کے ساتھ تعاون کیا۔

درحقیقت مہلاؤں کی بغاوت کسانوں، کاشتکاروں، غور رنگی علاقہ کے رہنے والوں کی بغاوت تھی کہ جو برطانوی نوپاریاتی نظام اور اس کے ساتھ تعاون کرنے والے زمینداروں کے خلاف تھی اور اس لئے اس نے اس نظام کی بنیادوں کو کھڑا کیا اور ہندوستان کی آزادی میں اس طرح سے بلاواسطہ حصہ لیا۔

گاندھی اور ہندوستان کی سیاست

لی۔ آری۔ نرانا نے 'گاندھی' پان اسلام 'زم' اور 'نیشنل ازم' کے عنوان سے کتاب میں گاندھی کی سیاست کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں اور ہندو مسلمان اتحاد اور اس کے ٹوٹنے کا مطالعہ کیا ہے اور خاص طور سے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ہندوستان میں 'انگریزوں کی حکومت کے قائم ہونے کے بہت بعد میں جب مسلمانوں اور اہل حق ہونے شروع ہوئے تو اس وقت مسلمانوں کو احساس ہو کہ بحیثیت 'ملت' کے وہ ان مسلمانوں اور اہل حق میں صاف کردار ادا نہیں کر سکتے تھے اور اس احساس نے ان میں مسلم حیثیت کو پیدا کیا اور یہی وہ احساس تھا کہ انہوں نے اپنی تاریخ اور ماضی کو نئے سرے سے اور نئے زاویے سے دیکھا۔

مسلمانوں میں سیاسی و سماجی بیداری کا کام سرسید احمد اور یوں کی علی گڑھ تحریک نے شروع کیا تاکہ مسلمان تہذیبوں کو سمجھتے ہوئے ان میں خود کو ڈھال سکیں مسلمانوں کی ابتدا کی بنیاد پر جس میں سرسید 'حسن الملک اور وقار الملک' شامل تھے اس کی یہ خصوصیت تھی کہ یہ لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عازمت میں معینوں عہدوں پر کام کر چکے تھے اور اس حیثیت سے ان میں برطانوی حکومت کا اثر اور احترام تھا اور اسی لئے یہ ۱۸۵۷ء کے تحریک کے بعد برطانوی حکومت سے کسی مزاحمت کا سوچ بھی نہیں کئے تھے اور اس کے ساتھ وقار و باری اور احاطت گداری کے ساتھ رہتا چلا جاتا تھا۔

اس کے برعکس بعد کی نسل جو برطانوی دور میں 'یورپ' تعلیم کے بعد 'بھری' جن میں راجا بھائی کرشنی 'فیروز متا' سرزور ہاتھ 'نیرجی' اور گوکھلے تھے انہوں نے 'زاد پیشوں کو اختیار کیا' جس میں وکالت کا پیشہ مقبول تھا اس لئے یہ لوگ اپنی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھ سکے اور حکومت سے اپنے حقوق کے لئے مطالبات بھی کر سکتے تھے۔

سرسید نے اگرچہ مسلمانوں کو انجی ٹیشن کی سیاست سے دور رکھا تھا مگر انہوں نے مسلمان طالب علموں کو یورپی اور مغربی تعلیم کے ذریعہ روشن خیال بنانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی میں یہ بھی کوشش کی کہ ان میں مذہبی تعصب پیدا نہ ہو لیکن سرسید کے بعد علی گڑھ قدامت پرستی اور رواج استغیث کی طرف چلا گیا اور اس میں وقار الملک کا ہاتھ تھا جو کہ علی گڑھ کے ۱۸۵۸ء سے ۱۸۸۸ء تک سرکاری تھے ان کے زمانہ میں اگر کسی طالب علم سے نماز چھوٹ جاتی تھی تو اسے کانچ سے خارج کر دیا جاتا تھا انہوں نے ایک لڑکے کو

اس لئے داخلہ نہیں دیا کہ اس کے والدین اس کے لئے نماز کی عارضی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے سینوں کے لئے علیحدہ صوبی مقرر کئے اور شیعوں کے لئے علیحدہ جگہ دی۔ انہوں نے کانچ میں اور سے بند کر دیئے۔ اس کے نتیجہ وہ طام جو سرسید کے زمانہ میں کانچ کے مخالف تھے اب اس کے حامی ہو گئے اور وحظ و تفریوں کے لئے یہاں آئے گئے۔

مسلمانوں کی سیاست اس دور میں اہمیت اہمیت مذہب کی طرف مائل ہوتی گئی اور مذہب میں بھی قدامت پرستی کی طرف 'شلی' نے سرسید سے علیحدہ ہو کر ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی اور اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کی راہنمائی کا حق صرف انہیں ہی ہے اور یہ حق بھی انہیں ہی ہے کہ وہ اسلام کی تعبیر و تفسیر کریں۔

علی گڑھ کانچ مزید قدامت پرستی کی طرف اس وقت آیا کہ جب ۱۸۸۳ء میں ڈی پی س راس' جو کانچ کے پرنسپل تھے انہوں نے یہاں علی زبان کا شعبہ شروع کیا اور اس کے پرنسپل میں ان کا خیال تھا کہ اس طرح سے علی گڑھ کے طالب علموں میں مذہب اور قدامت پرستی اور گمراہی ہو جائے گی۔

لیکن بعد میں مسلمانوں کی جوئی یڈرشپ بھری وہ پرانی سے اس لئے مختلف تھی کہ یہ برطانوی حکومت سے وقار و باری اور اطاعت کو پہنچ کر رہے تھے کیونکہ اس وقت جو صورت مل تھی وہ کہ بنگال کی جنگوں میں ترکوں کے خلاف برطانیہ دور پرانی قور سے جو رویہ اختیار کیا اس سے یہ انجالی بایوس ہوئے اس لئے انہوں نے کل کر برطانیہ کی مخالف کی اور برطانوی حکومت کے خلاف کام کرنا مناسب سمجھا لیکن وہ حالات تھے کہ ۱۸۸۶ء میں لکھنؤ کا معاہدہ ہوا تاکہ ہندو و مسلمان مل کر انگریزی راج کے خلاف جدوجہد کر سکیں۔ جب پہل جنگ سے پہلے حالات تحریک پہلی تو اس میں مسلمان راساؤں نے برطانیہ کے خلاف قدامت اٹھاتے ہوئے ہندوؤں سے اتحاد کر لیا۔ لیکن وہ زمانہ تھا کہ جب گاندھی ہندوستان کی سیاست میں آئے گاندھی کے آنے سے پہلے ہندوستان کے رہنماؤں کا بول نہ تھا وہ یہ کہ اہمیت اہمیت برطانوی حکومت سے قانون ساز اسمبلیوں میں نشستیں جائیں اور منتخب ماسندوں کی تعداد بڑھانی جائے۔ گاندھی نے آنے کے بعد ہندوستان کی سیاست میں عوام کو بھی شامل کیا پتا چلا اس سلسلہ میں پہلی بڑا کل روستاں کے خلاف تھی جو ۱۹۰۶ء کو ہوئی اس میں پورے ملک میں لوگوں نے بڑا ناں کر کے اپنی شہریت کا اظہار کیا۔

گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک اور مخالفت دونوں کو ساتھ ملا کر اس بات کی کوشش کی کہ ہندو-مسلم اتحاد برقرار رہے اور سیاسی طور پر دونوں مل کر جدوجہد کریں۔ اس جدوجہد میں مسلمانوں کا امرہ کا طبقہ بالکل علیحدہ رہا کیونکہ وہ کسی بھی صورت میں حکومت کی ناراضگی نہیں چاہتے تھے۔ مگر عام طور پر اس صورت حال سے پرہیز اور فائدہ اٹھایا اور مخالفت تحریک کی راہنمائی پر قبضہ کر لیا اور صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے شریعت کو رٹ قائم کر کے اور ذکوہ کو دھوکے میں رکھ کر اپنی علیحدہ سے سیاست بنا ڈالی۔

ہندو-مسلمان اتحاد اور تحریک میں اس وقت والیں پڑیں کہ جب ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں مولانا جواہر لعل نہرو کی رپورٹ میں 'بہتری' میں قیادت ہوئے اور جب چار چاندی کے واقعہ کے بعد کہ جس میں مجمع سے قتلہ کو آگ لگا کر کچھ پولیس و سول کو زندہ جاوے تو گاندھی نے تحریک ختم کر کے کا اعلان کر دیا۔

یہ تحریک اس لئے بھی کمزور اور ناقص ہوئی کیونکہ ۱۹۳۳ء میں مسلم لیگ نے خلاف کوشش کرنے کا نکتہ کر دیا جس کے بعد مسلمانوں کے لئے اس عقیدے کے لئے جدوجہد کا کوئی سارا بقی نہیں رہا۔ دوسرے مخالفت کشی کے ممبران نے عوام کے چندوں میں جو خود رو کی تھی وہ لوگوں کے سامنے آئی اور اس کا اعتماد اس پر سے بالکل اٹھ گیا۔

اس کے علاوہ تحریک ہرم حادوں میں زیادہ متوسط طبقہ کے لوگ تھے جن میں دیکھ چھوئے، تاجر، مزدور اور املاک دار شامل تھے۔ یہ لوگ ایک طویل جدوجہد میں شامل ہونے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے کیونکہ اس صورت میں ان پر بہت زیادہ مالی بوجھ پڑتا اور گاندھی کسی بھی صورت میں اس پر تیار نہیں تھا کہ تحریک کی راہنمائی عوام کے ہاتھوں میں چلی جائے اور پھر یہ پریشانہ صورت اختیار کرے اس لئے اگرچہ عدم تعاون اور مخالفت تحریک کے خاتمہ نے وقتی طور پر تحریک کو نقصان پہنچایا مگر اس سے تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ ان عجیبات سے جو کچھ سیکھا اس کے نتیجہ میں یہ مہیاں موثر بن کر ابھری۔

شرکی کچی آبادیاں

پاکستان کے بڑھتے ہوئے مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ شہروں کی تیزی ہے جس تیزی کے ساتھ شہر بڑھ رہے ہیں اسی تیزی کے ساتھ ان مسائل کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔ شرکی آبادی کے ساتھ جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان میں مکان، ٹرانسپورٹ، تعلیم، صحت، بجلی، ایندھن اور روزگار شامل ہوتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ آبادی کے اضافہ اور شرکی مرکز میں کے ساتھ ہی شرک کا ایک خاص کلچر پیدا ہوتا ہے اسی کلچر میں لسانی طور پر دیہات کا شکار لوگ مشیات کے ذریعہ سکون حاصل کرتے ہیں تو دوسری طرف محروم لوگ جرائم کے ذریعہ اپنی محرومیت کو دور کرنا چاہتے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد سے شہروں کی سماجی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی اہمیت میں ایک دہشت تیزی آئی ہے جب تک شہر چھوٹے تھے اور لوگ گلیوں میں ایک طویل عرصہ سے آباد تھے اس وقت تک مقامی تعلقات پائے گئے تھے لوگ ایک دوسرے سے ملنے جاتے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ ایک طویل عرصہ سے ایک ہی گلی میں رہنے کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے باپ دادا اور خاندان کو جانتے تھے اور گلی کے بزرگ یہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ وہ بچوں اور نوجوانوں کے کردار پر نظر رکھیں۔ گلی میں چوری اور جرائم بہت کم ہوتے تھے اور جس کا بھی کردار معاشرے کی معیاری قدروں کے مطابق خراب ہوتا اس کا معاشرے اور گلی میں عزت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ سارا منظر اب بالکل تبدیل ہو گیا ہے، خصوصیت کے ساتھ تقسیم کے بعد پاکستان کے شہروں کا ڈھانچہ بالکل بدل گیا، کراچی، لاہور، پٹنہ اور حیدر آباد میں جو لوگ ہجرت کر کے آئے ان کی ایک بڑی تعداد شہروں میں آباد ہوئی گلیوں کو وہ بدلتی تصویر بدل گیا، خاندان والے قبیلے ختم ہو گئے اور نئے تعلقات اب لوگوں کے درمیان قائم ہوئے پرانی نسل کو اس ہجرت نے بالکل بے کار کر کے ایک طرف کر دیا۔ نئی نسل کو پیسے کے مقابلہ میں زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تعلیم اور ملازمت و روزگار ان کے ایسے مسائل ہیں۔ کہ جن کا حل معاشرے کے موجود ڈھانچہ میں نظر نہیں آتا اور پھر ان مسائل کو جھانسنے میں شہروں میں پائیدار ہوئی ہوئی سولتیں اور تقریبیں ہیں۔ ایک وقت تھا کہ شہروں میں محل چھپیں ہوتے تھے، پائنت، کھیل کے میدان اور شر کے روگرد کھیت یا جنگل مگر

گیا ہے اور اس کے آگے لوگ خود کو بے سار اور مجبور پاتے ہیں، چونکہ ادارے ملک میں صوری ادارے بھی مضبوط نہیں اس لئے لوگوں کے لئے ان پر تنقید کرتا یا ان کی بدعنوانیوں کو سامنے لے کر کامی کوئی رسیج نہیں۔ اشیاء کے ذریعہ بھی پولیس کے خلاف کچھ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جہاں پولیس اور امداد سے رشتہ لیتی ہے اجارہ دہوں پولیس والوں سے پیسہ لیتے ہیں۔ پھر کوئی بھی حکومت ہو وہ پولیس کے ادارے کا بیشہ دفاع کرتی ہے اور اس کی خرید و فروختوں اور کھانوں کو دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی

پولیس کی ناکامی کی وجہ سے بھروسہ اور بدعنوان لوگوں کا طبقہ طاقتور ہو گیا اور اپنی دولت کی وجہ سے اس نے جائیداد و سرخ حاصل کر لیا کہ ان میں سے اکثر مشاہدہ میں جڑے عزت دار اور محترم بن گئے ہیں ہمدردی اور سلفک شرط نہ پیشہ بن گئے ہیں۔ رشوت لینے یا آپ کو شرمندہ نہیں ہوتا، قانون کی پالتی کسی کی خدمت ہو چکی ہے بلکہ دلوں کو دینا بیک امی حاکم بن گئی ہے مثلاً یہ ایک فحش بات ہے کہ قانون و جرات نہیں رہتا مگر مجھے یہ حاکم مل گئی۔ جرائم کی اس قدر برسات ہوئی تو لوگ اب ان کے عادی بھی ہو گئے ہیں، ایک زمانہ میں چوروں و دات کے اندر میرے میں ہوتی تھیں مگر اب یہ ڈاکہ دینا دھاڑے ہوتے ہیں، لوگوں کی کاریں اور اسکوٹریں چھینی جاتی ہیں، عورتوں کے پرسوں سے کچھ کر کے جاتے جاتے ہیں مگر اب ان جرائم کے سے نہ تو تاج کے جذبات باقی رہے ہیں۔ ورنہ اپنا پر غم و غصہ کا کھار ہوتا ہے۔ بڑے بڑے مجرم قوی میڈر بنے ہوئے تاریخ میں اپنے لئے جگہ بنا رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ریاست کا دوسرا بڑا ادارہ نوکری بھی انتشار کا شکار ہے ہر ایک دفتر کے دہر والوں کا ایک بھرم ہوتا ہے اور ان کے اپنے ترغیب منور ہوتے ہیں، گاڑیوں کا سنسن لیتا ہو، یا بھلی قمیص و فون لگوتا ہو، ڈوبیل کل ہوتا ہو یا شاختی کا بڑا حاصل کرنا، ایک سلسلہ ہے کہ جس میں دلوں کے ذریعہ کام ہلدی اور خوری ہو جاتا ہے۔ اس لئے حکومت کے افسروں کی کوئی عزت و احترام نہیں کیونکہ یہ ایک ایسی شے بن گئے ہیں کہ جیسے خریدنا چاہتا ہے۔

اور یہی کچھ حکومت کے دوسرے اداروں اور حکومت کی ذمہ داریوں اور فرائض کا ہے کہ حکومت نہ تو تعلیم کی ضروریات پوری کر رہی ہے نہ صحت کی ذمہ داری لیتی ہے اور نہ ہی پبلک ٹرانسپورٹ کی طرف توجہ دیتی ہے۔ جب لوگوں کو ان کی بنیادی سہولتیں نہیں ملتی ہیں تو پھر وہ ان کے لئے دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں ان میں سے ایک

طریقہ تو اپنی تھانوں کی بنیاد پر جمائیں اور کلب بٹا ہوتا ہے اگر لوگ مل جل کر نہ رہیں۔ کو آسانی سے پورا کریں، اپنی تھانوں کی جماعتیں ادارے ہاں بہت کم ہیں، کیونکہ جس کی دست علی اور موثر ہوتی ہیں جب لوگوں کو ایک دوسرے پر اعتماد ہو، چونکہ ان میں یہ اعتماد ختم ہے اس لئے ایسی جماعتیں بھی بہت کم ہیں۔ اور اگر جتنی بھی ہیں تو بہت خستہ و ناتوان ہیں اس لئے اس خستہ فائدہ اٹھا کر ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے آجرات اور غلج کمانے کی بنیادوں پر ادارے شروع ہو گئے ہیں۔ حکومت تعلیمی ادارے نہیں کھلی سکتی تھیں تو اس کی کو پورا کرنے کے لئے کئی اسکول جگہ جگہ کھل گئے ہیں، اور لوگوں کی توجہ و درخواست کے لئے اکثر سکول نکلتے میڈیم کے ہیں۔ اب اسکول کے بھر آہستہ آہستہ پرائیویٹ کالج اور یونیورسٹیاں بھی کھلنا شروع ہو جائیں گی، جب سرکار ہسپتالوں سے یہ میں غائب ہوئیں اور میسر و دیکھیں۔ مثلاً یہ کہ اب جی سپتال قائم ہونا شروع ہو گئے اور یہی بڑی نیشنل حقارت کے، ہرین کلب سے اپنی دکانوں کو چھٹا شروع کر دیا۔ یہی صورت حال پبلک ٹرانسپورٹ اور دوسرے اداروں کی ہے کہ ہر جگہ حکومت کی جگہ کئی اداروں نے لے لی ہے۔ چونکہ ان کئی دلوں کا مقصد کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانا ہے اس لئے ان کے نزدیک لوگوں کی خدمت یا لوگوں کی تلاش و بھروسہ کے لئے کام کرنا کوئی مقصد نہیں ہوتا بلکہ ایک انسان ان کے لئے ایک شے ہو رہا ہے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ پیسہ حاصل کرنا سہل ہو رہا ہے۔

ان حالات کی وجہ سے شہروں میں نسلی تعلقات میں لہر دست تبدیل آتی ہے خالص انسانی بیرونی پر دوستی اور دشمنی کم ہو گئے ہیں اور تعلقات کی نوعیت مکمل تجارتی ہو کر رہ گئی ہے۔ لوگوں کی مجبوری پر ان سے بدرفتاری کرنے کے بجائے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی ہمت کی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ شہر میں یہ بددیہی بڑے شہر کے اندر سب سے زیادہ ہے چھوٹے شہر اور گاؤں اس تبدیل سے زیادہ دوچار ہیں۔ شہروں میں زندگی کی رفتار جس تیزی سے ہے اسی تیزی سے لوگوں کی عزت اور رجحانات بھی بدل رہے ہیں۔ کالیں موسیقی سب کہ جس میں نرم اور خوشگوار سکون ہے اس مظالم دور میں پسند نہیں کی جاتی بلکہ اس کی جگہ ہنگامہ جڑ اور شور مچانے والی متحرک موسیقی پسند بن گئی ہے۔ وہ میں مدافعی تاویلوں یا کتابوں کی جگہ جرائم کی کتابوں کی جائیں گئی ہیں، چونکہ آمریت میں قسم ہی نہیں ہے اس لئے اب تفریح کا سب سے بڑا درجہ تو سینما ہیں یا بھاری سی آو۔ پلازوں اور مارکیٹوں میں کتابوں کی دکانیں نظر نہیں آتیں، اس کی جگہ یا تو

کپڑوں یا جوتوں کی دکانوں کی اکثریت ہے یا پھر کھانے پینے کے اشیا کی بھراوا ہے کھانے
انہی سے ہونے لگے کمرے اور مرنے دکانوں پر لئے لگے ہوئے ہمارے مذاق اور کچھ کا ایک
ایسا موروثی ہوش کرتے ہیں۔ ایک طرف ہمیں خوش پوش اور پیسے والے ان اشیا پر مزہ
کے کنارے کھانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ تو وہیں ان کے سامنے بچے اور عورتیں اس
کے شکر رہتے ہیں کہ ان کا ہونٹا ہو شاید انہیں مل جائے ان کی گرسہ لگائیں ہر لمحہ کا
بچہ رتی ہیں مگر تعجب ہے کہ پھر بھی یہ قسموں میں نہیں اکتلتے۔

۳

پاکستان کا ہر بڑا شہر اپنے اندر کئی شہر سائے ہوئے ہوتا ہے۔ شہر کی سبیلیاں سماجی و
معاشرتی لحاظ سے تقسیم ہوتی ہیں۔ یہ تقسیم زمین و مومن میں ہو سکتی ہے 'طبقہ اعلیٰ' ان کی
کوٹھیاں ۳۵ اور ۳۰ کنال سے لے کر ۳ کنال تک ہوتی ہیں 'اس کے بعد متوسطہ درجہ کے
لوگ آتے ہیں کہ جن کے مکان ۱۰ کنال سے ۱۰۰ مربع تک کے ہوتے ہیں 'اس کے بعد
مرتلے والے چھپے درجہ کے لوگ 'اس تقسیم کے لحاظ سے ان آبادیوں کی سوئیں ہوتی
ہیں۔ امراء کی بستیاں میں پختہ 'سڑکوں کے کناروں پر دفعت' درخانے کیوں چہ جڑوں
و نگاہ کو سرور بخش کاسے 'سڑکیں چوڑی صاف ستھری ہوتی ہیں کوڑے پکڑے کو باقاعدگی
سے انضام کیا ہے 'کم آبادی اور بڑے مکانوں کی وجہ سے ہر طرف خاموشی اور سکون ہوتا
ہے 'یہ سوئیں دوسری دو سوئیں میں آتے آتے کم ہو جاتی ہیں 'سڑکیں تنگ و دفعت
ہوتی جاتی ہیں 'درختوں کے ٹکڑے کی ٹکیوں پائی نہیں جاتی ہیں 'ٹرینک کا شور و غل بڑھ جاتا
ہے 'کلی ٹکیوں ختم ہو جاتی ہیں 'تالیاں اور گڑا پختے نظر آتے ہیں کوڑے پکڑے کے
ذبحہ جگہ جگہ لگے ہوتے ہیں کہ جنہیں کوئی اٹھانے والا نہیں ہوتا۔ پکڑے ہوئے اور آئے جانے
کی وجہ سے پکڑے جاتا ہے 'مکان بھونے در تنگ ہونے کی وجہ سے گلیوں 'بازاروں' اور
سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم نظر آتا ہے بچے گلیوں اور سڑکوں پر کرکٹ کھیلنے میں مصروف ہوتے
ہیں زندگی کی محبت ہو چورے لڑو شور سے جاری رہتی 'میں سب سے بڑا پھر
شہر کی وہ چکی کھادیاں ہیں کہ جہاں سانی لحاظ سے ہی فائدہ اور کچلے لوگ رہتے ہیں اور جہاں
ہوادری مسوئوں کا اقدان ہوتا ہے

ہر بڑے شہر میں 'خصوصیت کرچی' لاہور 'حیدرآباد' اور پٹنہ میں اس کی آبادیوں کی
تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے 'ان کو آباد کر کے والے دن رات ہیں کہ جو رہائش و رکھوں سے

ماذمت اور سانس کی تلاش میں مسلسل شہروں میں آ رہے ہیں۔ یہ لوگ جب وصات اور
بھونے گاؤں سے آتے ہیں۔ تو اپنے ساتھ اپنی نہایتی عادی اور نہایتی کچھ کو لاتے ہیں
شہر میں آتے ہی انہیں سب سے پہلا اور بڑا جھکا یہ لگتا ہے کہ ان کی اپنی کوئی حیثیت
نہیں رہتی اور یہ شہر کے ہجوم میں گم ہو کر خود کو کھو دیتے ہیں۔ گاؤں میں ان کی سانی کم
ترتی کے باوجود کچھ حیثیت ہوتی ہے مگر شہر میں آنے کے بعد یہ سنا سے چھین دی جاتی ہے
اور انہیں ہر طرف سے ٹکافت و دباؤ کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ شہر میں ہر نیا آنی والا اپنی
خواہشات ساتھ میں لاتا ہے 'اس لئے جب ماذمت کی تلاش یا رہائش حاصل کرنے کی
جدوجہد کرتا ہے تو اس کا مقابلہ اپنے ہی جیسے لوگوں سے ہوتا ہے 'اس کی مثال ہانگل ایک
تی ہے کہ جیسے ریلوے تقریباً گلاس ڈیپ سے جو بھرا ہوا ہوتا ہے 'ہر نئے سوار ہونے والے
کو اندر داخل نہیں ہونے دیتا 'مگر ایک مرتبہ جب وہ 'جانا ہے تو پھر اس تک جگہ میں وہ
بھی اپنی جگہ بناتا ہے۔ نئے آنے والا آچلے وہ تھا ہوا خاندان کے ساتھ 'سب سے بڑا
مسئلہ رہائش کا ہوتا ہے 'جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ حکومت رہائش 'صحت' 'تعلیم'
ترانسپورٹ کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ اور اسکی رہائی جو اسکیمیں ہیں
ان کا تعلق اس غربت اور بے گھر لوگوں سے ہانگل نہیں 'کیونکہ بڑے شہروں کی یہ
اسکیمیں بھی تو بڑے بڑے قیمتی پلاٹوں کی ہوتی ہیں کہ جنہیں صرف دولت مند ہی خرید
سکتے ہیں 'دوسرے یہ کہ ان اسکیموں میں تمام کالا دھندلا رکھنے والے پلاٹ خرید لیتے ہیں اور
پھر وقت آنے پر انہیں حقے واپس فروخت کرتے ہیں اس لئے ان اسکیموں میں ان کے
چلت بمت کم ہوتے ہیں کہ خود مکان بنا کر رہنا چاہتے ہوں 'اس لئے رہائش کی اشکی
ضرورت کے باوجود ان اسکیموں میں پلاٹ خلق پڑے رہتے ہیں۔ در 'ان کے یاد ہونے میں
دس سے بیس سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔

دکانوں اور پلاٹوں کی قیمتیں بڑھانے میں دوسرا ایٹھ 'بجٹی' والے کرتے ہیں 'اپنے
کیشن کو بڑھانے کی خاطر یہ قیمتیں بڑھاتے رہتے ہیں 'اور معزنی طریقوں سے مکانوں اور
پلاٹوں کو مرکا کرتے چلے جاتے ہیں کہ جس کی وجہ سے ایک عام آدمی کے لئے پلاٹ یا
مکان خریدنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن رہائش انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے 'اس لئے
جب یہ ضرورت قانونی طریقے سے پوری نہیں ہوتی تو سے غیر قانونی طریقوں سے پورا کیا
جاتا ہے شہروں میں کچی آبادی کے وجود میں آنے کا اثر عمل ہوتا ہے وہ اس طرح سے
شروع ہوتا ہے کہ پسے زمین پر تنہا کیا جائے 'پھر مکان تعمیر کیا جائے اور اس کے بعد ان

کی ملکیت کے حقوق کے لئے جدوجہد کی جائے۔ دوسری صورت میں ہو کہ قانون ہوتا ہے اس میں پہلے ملکیت کے قانونی نکالات حاصل کئے جاتے ہیں پھر زمین حاصل کی جاتی ہے اور آخر میں اس پر مکان بنایا جاتا ہے۔ زمین پر قبضہ کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ بے گھر لوگ ایک عمارت اور بارہا دس مل کر یہ ایسا رہتے ہیں کہ مملکت کی اس زمین پر قبضہ کیا جائے کہ جو غرور و بیکام ہو اور ضرر سے دور ہو۔ اکثر یہ زمینیں ریلوے سٹیشنوں کے کنارے یا قبرستانوں یا اگر پہاڑوں ہوں تو اس کے اوپر حکومت کی زمینوں کی بغیر آباد ہستیوں میں ان جگہوں پر جو سکون کا کاج و فیوا کے لئے چھوٹی گلی ہوں قبضہ اچانک کیا جاتا ہے رات کے وقت یا چھٹی کے دن اور فوری طور پر لوگ جگہ گھر کر اپنی جگہ پر لپٹا جاتا ہے۔ پولیس قانونی کارروائی سے بچنے کے لئے پہلے سے تیاری کی جاتی ہے یا تو رشوت کے ذریعہ کام لیا جاتا ہے یا وکیل کو تیار کر کے مقدمہ دراست میں داخل کر دیا جاتا ہے اور اگر پولیس ان کی جگہوں کو ہٹانے کے لئے آتی ہے تو خود تین بچے سامنے آکر رونا پیشا شروع کر دیتے ہیں تاکہ وہ سخت الزامات سے گھر گریں۔ اکثر خود تین انہوں کے قدموں پر گر کر خراشہ شروع کر دیتی ہیں۔ ان ہستیوں کے نام اکثر صاحب اقتدار لوگوں کے نام پر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ پولیس اور دوسرے ادارے ان پر کارروائی کرتے ہوئے محسوس قبضہ کے فوراً بعد ان آبادیوں کو قانونی درجہ دلانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی جاتی ہے لیکن جب تک ان کی قانونی حیثیت نہیں ہوتی اس وقت تک اس کے رہنے والے عدم تحفظ کا شکار ہوتے ہیں اور نہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ انہیں بے دخل نہیں کر دیا جائے اس لئے مکانوں کی تعمیر آہستہ آہستہ ہوتی ہے اور صرف ضرورت کے لئے کمرے بنائے جاتے ہیں چونکہ یہ گویا بیاں بغیر کسی منصوبہ در چلان کے ہوتی ہیں اس لئے گلیاں تیز می بیڑی اور تنگ ہوتی ہیں چونکہ حکومت کی باطل ذمہ داری نہیں ہوتی اس لئے یہاں نہ انہاں ہوتی ہیں اور نہ کوڑا اٹھانے کی سہولت اس وجہ سے یہ بے بنیاد ہر وقت گندے پانی اور کوڑوں کے ڈھیر میں چھپی رہتی ہیں اس طرح کھلی گیس کی سولتیس ٹائپ ہوتی ہیں۔ سبھی سے بھم پر جانے کے لئے کوئی پبلک ٹرانسپورٹ نہیں ہوتی اس طرح اسکول ہسپتال اور ڈاک خانہ وغیرہ بھی نہیں ہوتے لیکن مکان کے جوئے کی خواہش انسان میں اس قدر شدید ہوتی ہے کہ وہ ان تمام تکلیفوں اور پریشانیاں کو برداشت کرتا ہے اور اپنی رہائش کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔ ان بنیادی سہولتوں کے لئے وہ جو انسانی قیمت دیتا ہے اس کی وجہ سے اس کے مکان کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور اسے قانونی ہستیں

کے مقابلہ میں یہاں اغراہت برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

عدم تحفظ کے احساس اور مکان کو قانونی درجہ دینے کی عرصہ کی وجہ سے کچی آبادی کے لوگ مختلف جماعتوں یا یونینوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں ان کا پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حکومت پر دباؤ ڈال کر صرف ان آبادیوں کو قانونی درجہ دلایا جائے بلکہ حکومت سے بنیادی سہولتوں کے لئے مطالبہ کیا جائے۔ پاکستان میں کہ جہاں جمہوری حکومتوں کو وقت کم ملا اور فوری ذمہ داریاں اقتدار میں رہیں ان کے دور میں کچی آبادیوں کو اسی طرح سے تحفظ ملا کہ یہ حکومتیں اپنے ناچار وجود کو حرام میں مقیم بنانے کے لئے اپنے کاموں پر توجہ دیتی رہیں کہ جن سے ان کی جڑیں لوگوں تک پہنچ جائیں ان کو اس بات کا ڈر رہتا تھا کہ وہ حرام میں مقیم نہ ہوں اس لئے ان کی کوشش ہوتی تھی کہ لوگ پڑاں کرے اور جوں پر جبر نہ کریں اور جہاں تک ہو سکے ان کے معاملات مان لئے جائیں اس لئے کچی آبادی کے لوگوں کی سیاسی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے ہر دور حکومت میں انہیں قانونی درجہ دیا گیا اور اس طرح سے ان میں قبول ہونے کی کوشش کی گئی۔

دوسرا موقع تو کچی آبادیوں کو قانونی درجہ دلانا ہے وہ انتخاب کے وقت ہوتا ہے اس وقت تمام سیاسی جماعتیں ان کی حمایت کرتی ہیں اور ان کو قانونی دستاویزات دلانے کی جدوجہد کرتی ہیں اس طرح سے ایک مرتبہ جو کچی آبادی قائم ہو جاتی ہے اسے جلد یا بدیر قانونی حیثیت مل ہی جاتی ہے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے بڑے بڑے لوگوں یہ مسئلہ ایک ایسا گروپ وجود میں آ گیا ہے جو حکومت کی زمینوں پر قبضہ کر کے کچی آبادیوں پرانا ہے لوگوں سے پلاؤں کے پیسے وصول کرتا ہے اس گروپ کو ہم زمین طعنب کرنے والا ہتھیارے والا کہہ سکتے ہیں۔

کچی آبادیوں کی بلاستی تعداد جو سرکاری زمینوں پر آباد ہو رہی ہیں حکومت کو یہ ریاست کو اس زمین کا ایک پیسہ بھی نہیں ملتا اور یہ ساری رقم دلاؤں کے یا سیاست دانوں کی جیب میں جاتی ہے دوسری طرف بنیادی سہولتوں کے لئے عسقی کے لوگ جو خرچ کرتے ہیں اس کا منافع بھی حکومت کو نہیں ہوتا اس طرح یہ صورت حال متوازن ریاستی دعوں کو بے اثر کرتی ہے۔

رہائشی ہستیوں کو اگر منصوبہ کے تحت بنایا جائے ان میں بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں تو اس صورت میں شہر کے رہنے والوں کی تعلیمات میں جائے گی اور اگر شام کو کام سے واپسی پر اسے گھر میں سکون مل جائے تو پھر دوسرے دن نئی توانائی کے ساتھ کام کے

کراچی کی بچی آبادیاں اور سماجی مسئلہ

یون فون امریکن

کراچی میں سب سے زیادہ انہوں نے ایک پہلو میں۔ عرصہ و مہینوں کے لوگوں کی بچی آبادیوں ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ سب بچیوں کی مائی میں تقریباً ۲۰ فی صدی اس طرح مشغول ہیں جو قانونی راجع سے مکمل نامناسب ہیں۔ بچے میں ۱۰ تا ۱۵ سالوں کی قیدیوں کی کھلی کے سب سے بہت زیادہ ہیں۔ در ان عیبوں کو فرس پر بندہ بھی میں مل سکتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ان عیبوں کو ان کی اہلیت رہائش کے حصول کے لئے غیر قانونی طریقوں کو اختیار کرتی ہیں۔ اگرچہ اس طرح سے دشمن پر ناجائز قبضہ کر کے مکمل بنائے میں بڑے خطرے سے دوچار ہیں خصوصیت سے شروع سال میں مگر سب سے کہ جب اس کے تمام راستوں کو بند کر دیا جاتا ہے تو اس صورت میں وہ ہر خطروں لینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

چونکہ اس قسم کی غیر قانونی آبادیوں میں بنیادی مسلوں کا فقدان ہوتا ہے اس لئے زندگی بڑی مشکل اور دشوار ہوتی ہے اور ابتداء ہی سے ان کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ ۳۰ تا ۸۰ گز کے پلاٹ پر جس پر انہوں نے ناجائز طور پر مکان بنایا ہے اسے کس طرح سے قانونی بنایا جائے مگر ان کی یہ جودھد مظاہروں پر نالوں یا عیبوں کے درپہ نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کام وہ حکام بالا یا یا خرابی کے راجعوں سے درخواستوں کے ذریعہ کرتے ہیں۔ مثلاً اس کا نمونہ یہ درخواست ہے:

جناب عالی

ہم راجہ شہد صاحبین جو کہ دہلی سے ہجرت کر کے آئے ہیں بڑے ادب اور عاجزی سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کو کم از کم سو گز کا ایک پلاٹ الاٹ کیا جائے۔ آپ کو اس بات کا پتہ ہو گا کہ ہم بڑے بڑے حالات میں اپنی جائیں بچا کر کراچی آئے ہیں ہماری تمام جائیدادوں اور حلال کو ہماری طرح سے ہوتا گیا۔ در ہم خود تنہا مصیبتوں کے بعد خدا کے فضل و کرم سے آپ کے شریف آئے ہیں اور ادب میں رہائش کے لئے سرگرداں ہیں۔

یہ ان صاحبین کی درخواست کا ایک حصہ ہے جو ۱۹۸۳ میں ہندوستان سے کراچی

آئے تیار ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہوں اور دینیوں میں رکھے کھانے کے بعد اسے گھر آکر چائیک ٹکے سے پانی بھی پیرا ہو تو معمولی باتوں پر دوسروں کی رائیوں پر تنجب نہیں کرنا چاہئے اس صورت میں ہماری 'نیں' اور قبائلی ٹکڑے بڑی آسانی سے پیدا بھی ہو سکتے ہیں اور یہ جلد ہی تو بھی پکا سکتے ہیں۔ اگر خاندانوں کو معاشی طور پر سکون ہو اور انہیں سرحد چنے کو جگہ پھر ہو تو پھر اسان فرمت کے لحاظ کو نقل و حرکت کری میں غرضاً سب کچھ کرنا چاہے گا وہ اسیں خوشی و سہت کے لئے وقف کر دے گا۔

اس وقت پاکستان کے بڑے شہروں میں جو نسلی و مذہبی فسلوات استہ پڑے ہیں ان کی ایک بڑی وجہ شہروں میں ہماری مسلوں کے فقدان ہے۔ ہمارے حکمران ان مسلوں کا حل اکثر یہ ڈھونڈتے ہیں کہ جو ہم کی روک تھام کے لئے پولس کی تعداد بڑھا دی جائے اور لبادات کو روکنے کے لئے نہیں ہوجے ہمسایوں سے مسلح کر دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ یہ حل عملی ہیں۔ جرائم کو اسی وقت ختم کیا جا سکتا ہے جب کہ ان کی بنیاد کو ختم کیا جائے مگر ان کی بنیاد کو اس لئے ختم کیا جا سکتا کہ اس صورت میں ہمارے حکمران جتوں کو اپنی بہت سی مراعات سے دستبردار ہونا پڑے گا اور فی الحال وہ اس کے لئے تیار نہیں۔ دوسری صورت میں اگر بھی صورت حال جاری رہی اور لوگوں کے سامنے تبدیلی کے تمام راستوں کو بند کر دیا گیا تو اس نتیجہ میں سوائے یہ تشدد تبدیل کے اور کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہے گا۔

آئے تھے اس درخواست کا جو لہجہ اور انداز ہے وہ ۱۸۷۳ء کی درخواست میں بھی دیکھی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ ایک درخواست ہے جو ایک جمعی کے لوگوں نے اپنی اپنی کی برائی کو دیکھی تھی۔

جانب کی وجہ اس بات کی جانب دلائی جاتی ہے کہ محزز المیران نے مہائی فرا کر ہمارے مسائل پر غور کیا اور ہر مسئلہ پر جمعی کے محززین سے بات چیت کی اور غفل کے ساتھ ان کی رائے کو لیا۔ ان کی اس مہائی کی وجہ سے آبادی کے تمام لوگ ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست پر حالات کا مکمل جائزہ لیا اور ہمیں بے مشکل اور قیمتی نصیحتوں سے نوازا اس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ آبادی کے تمام لوگ ان کی یہ شکل در قتل تریف ملوک سے بہت متاثر ہیں اور ان کی آمد کیلئے شکر گزار ہیں۔

”خیر میں ”آپ کا تبعہ ر خادم“ اور پھر اس کے بعد دیکھا ہیں۔ ان دونوں درخواستوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں المیران کی عزت کا واضح طور پر عداوت کیا گیا ہے۔ ان دونوں درخواستوں میں ایک لفظ بھی اپنے حقوق کے بارے میں نہیں ہے اور نہ ہی المیران کے خلاف کچھ ہے۔ ان درخواستوں کے متن سے عدالت کی مراعات اور زیادہ مستحکم ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ درخواستیں باقاعدہ لکھ پڑھ ہیں اور ان پر دیکھا کرنے والے لکھائی کے سرکہ لوگ ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ درخواستیں گم نام اور معمولی لوگوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ ان میں کسی بھی حقوق کی بات نہیں کی گئی ہے۔ اس کے بجائے المیران سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ان کا کام کر کے انھیں معذور کریں۔ درخواستوں کے آخر میں یہ اضافہ بھی ہے کہ ”جناب ماں کے ساتھ کے لئے“ اور ”ہمردانہ غور کے لئے“ اور ”ہمردانہ مشکلات کے لئے“

ان درخواستوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ رہائش کے حصوں کے لئے یہ درخواستیں کسی مجلس کی طرف سے نہیں ہیں بلکہ لوگوں کی طرف سے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرہ کا نظام سرپرستی اور معیشت پر ہے اور اس نظام میں سرپرست وہ ہے جو کہ بااثر ہے اور لوگوں کا کام کر سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں جس کا کام ہوتا ہے وہ اس کی ہر خدمت پر تیار رہتے ہیں۔ اس نظام میں یہ سرپرست اپنے سے زیادہ طاقتور اور بااثر کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اس طرح اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک دوسرے کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اس طرح سرپرست یہ نہیں چاہتا ہے کہ مسائل حل ہو جائیں کیونکہ

مسائل حل ہونے کی صورت میں اس کا اثر و سوج اور اہمیت ختم ہو جاتی ہے اس لئے ان حالات میں مسائل کو صرف جزوی اور عارضی طور پر حل کیا جاتا ہے۔

اب تک حکومت کی جانب سے ایسا کوئی باقاعدہ منصوبہ نہیں بنایا گیا کہ جس میں کم آمدنی والے لوگوں کو بڑا جائزہ ہاں اس قسم کے پیکر گرام ضرور بنائے گئے کہ شہر کی کئی آبادیوں کو کس طرح قدرتی طور پر ختم کیا جائے۔ ایسے کوئی منصوبہ کو جن کے دوسرے کم آمدنی والے لوگوں کو بڑا جائزہ مکمل نہیں ہوئے۔ اس کے مقابلہ میں ۹۹ کے قریب پبلک ایجنسیاں رہائش کے مختلف منصوبوں پر کام کر رہی ہیں۔ مگر ان سب میں نہ تو ایک دوسرے سے کوئی رابطہ ہے اور نہ تعلق اس وجہ سے اکثر متضاد قسم کے منصوبوں پر عمل ہوتا ہے۔

اس کی مثال چیک لائنز کے منصوبہ سے دی جاسکتی ہے جسے دوبارہ سے نئی شکل میں آباد کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو وہ تمام منصوبے مکمل ہو گئے کہ جن میں رہائش کی تبدیلی کو گراہی کے دوسرے طریقوں میں تبدیل کرنا تھا۔ پھر یہ منصوبہ بنایا گیا کہ انھیں اس جگہ پر سے لکھنؤ میں آباد کیا جائے مگر کہ۔ ڈی۔ اے کے ماسٹر پلان شہر نے اسے رد کر دیا۔ دوسرا عدالتی ترقی کا منصوبہ تھا جو جزوی طور پر مہ کی دھاتی میں پورا ہوا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ منصوبہ بندی اور اس کے عمل درآمد کرنے میں نہ کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ رابطہ در اس لئے یہ کامیاب نہیں ہوتا۔

اور اگر کوئی منصوبہ بنایا جاتا ہے تو اس کی پوری طرح سے وضاحت نہیں ہوتی مثلاً ۱۹۴۴ء میں کراچی کی ترقی کے لئے دس سالہ منصوبہ بنایا گیا۔ اس کی تعریف نو بہت کی گئی مگر اس کے علاوہ کے لئے جو رقم درکار تھی وہ پوری نہیں کی گئی اس طرح منصوبہ کے منتخب پیمائش پر عمل ہوتا ہے اور پورے منصوبہ پر کسی کام نہیں ہوتا۔

جب کسی منصوبہ کے مختلف حصوں پر عمل کیا جاتا ہے تو اس سے حکومت کی مشغلی اور وہ المیران جو اس میں ملوث ہوتے ہیں ان کے اثرات بڑھ جاتے ہیں اور صرف ان لوگوں کو لاکھ پانچائے ہیں کہ جن سے انھیں یا حکومت کے سیاسی مساعروں کو فائدہ پہنچے عرصہ تک نوکر شاہی کا ذہنی متاثر۔ خواب حالت ”فیروزہ“ دی اور ناقص منصوبہ بندی یہ سب لکھنؤ میں بھی منصوبہ کو مکمل کر سکتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں جب حکومت نے چنگی آبادیوں کو قانونی درجہ دیا تو اس کے نتیجے سے حدود اہل تاریخ نکلے۔

۱۔ کیونکہ کئی آبادیوں کو قانونی درجہ دینے کے لئے ان کی ترقی کا کوئی واضح طریقہ کار موجود نہیں ہے اس لئے پبلک ایجنسیاں ترقی کی غفلت کرتی ہیں۔ اور تمام منصوبہ بندی نام ہو جاتی

۱۔ منصوبہ بندی کا کام بہت دیر سے شروع ہوتا ہے اور غیر متعلق قوانین و ضوابط کو اختیار کیا جاتا ہے اور آخر میں ان کے احکامات کے بعد تمام منصوبوں کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

اس منصوبہ میں سرکاری کا عنصر اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اور یہ سرکاری اس وقت امریکی ہے جب کہ حکومت کی مشینری اور ایجنسی موجود نہ ہو۔ اس وقت کوئی شخص اپنی ذاتی پسند کے مطابق حکومت کے رائج کو استعمال کر کے اپنی حیثیت کو مضبوط کرتا ہے۔

۱۹۴۵ء کی دہائی میں حکومت نے پہلی مرتبہ کم آمدنی والے لوگوں کے مکانات کا منصوبہ بنایا۔ پہلا کام یہ کیا گیا کہ غیر قانونی آبادیوں کو قانونی درجہ دیا گیا اور پھر دوسرا کام یہ کیا گیا کہ مکانات کی تعمیر کے لئے زمین منتخب کی گئی۔ اس میں پہلا کام کے سلیم سی کے ذریعہ جبکہ دوسرا کام کے سی کے۔ ان دونوں میں کسی قسم کے وابہ کی گنجائش نہیں تھی۔ کچھ آبادیوں کو قانونی درجہ دینے میں طویل عرصہ لگا۔ ۱۹۵۹ء میں اس کے قوانین بنائے گئے اور پھر آگے چل کر ایسے حالات ہوئے کہ مقامی حکام اس کی منظوری کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ پھر ۱۹۶۸ء اور ۱۹۸۸ء کے درمیان مارشل لا حکومت نے کچھ آبادیوں کو قانونی درجہ دینے کی منظوری دیدی اور اس کے بعد ان آبادیوں کو قانونی بنانے کے قوانین و ضوابط بنائے گئے۔

کچھ آبادیوں کی ترقی کے منصوبہ پر عمل درآمد ہونے میں بھی متبادل پیریں رہیں۔ جن میں مثلاً بدیع ٹاؤن کے کچھ حصوں میں تفصیلی منصوبہ بندی سے پہلے کچھ ترقیاتی کام ہو گیا۔ جب کہ دوسرے علاقوں میں کہ جن کا منصوبہ منظور ہو چکا تھا۔ انھیں بے عرصہ کے لئے ٹھکرا کر رکھا۔ ایک دوسری مثال غریبہ کالنی کی ہے کہ جسے قانونی درجہ دینے کے بجائے مارشل لا کے حکم کے تحت ہٹائے کا فیصلہ ہوا۔ مگر ایک سیاستدان کی مداخلت کی وجہ سے یہ نہ صرف قائم رہی بلکہ اسے فوری طور پر قانونی درجہ دینے کے احکامات بھی یہ لے گئے اور جلدی میں اس کے لئے قوانین بنائے گئے مگر اس سیاستدان نے قانون حیثیت سے کام کو چھ مہینے تک روک دیا۔ اگرچہ اسے فوری طور پر ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن سرپرست کا یہ ایک سیاسی حربہ تھا کہ اس کی وجہ سے لوگ اس کے قابو میں رہیں اور آخر میں وہ یہ ثابت کرے کہ ان کا کام محض اس کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ ایسا ہوا امکان تھا۔

اس عمل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پالیسیاں، قوانین و ضوابط کی کوئی حیثیت نہیں

بلکہ یہ سرپرست ہوتا ہے جو لینے کرتا ہے اور ان پر عمل درآمد ہونے چاہئے اور دوسرے مسئلہ کہ جس میں کم آمدنی والوں کے مکانات کے لئے زمین کا تعلق تھا۔ تو اس کا یہ ہوا کہ تمام شہر اور پریکٹس کے باوجود ۱۹۵۰ء دہائی چلتا ہو کہ ان لوگوں کے لئے مقبوعہ ہوتے تھے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۵ء تک یہاں پر ۲۰۰۰ خاندان بنائے گئے۔ اور ان میں سے کچھ یہ ان لوگوں کو ملے کہ جن کا اس منصوبہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

خاص طور سے جب کراچی کی بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھا جائے جو ۳۰ سال سے بڑھ کر ۷ ملین ہو گئی ہے تو اس میں خطرہ ہے کہ آمدنی والے لوگوں کی رہائشی اسکیس نہ ہونے کے برابر ہیں اور جب ان لوگوں کو قانونی طور پر مکانات نہیں ملتے ہیں تو پھر یہ لوگ غیر قانونی طریقوں سے زمین حاصل کرتے ہیں۔ اور اس حالت میں تقریباً ۱۰۵ ملین لوگ رہ رہے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کراچی کی سرکاری زمین کو بھی لوگوں نے بے درمیان تقسیم کر لیا ہے اس طرح سے حکومت اس قسم کی غیر قانونی کارروائی میں ملوث ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ خود تیار کاری کے طریقے مینا نہیں کرتی اور دوسری طرف جب لوگ غیر قانونی طور پر زمین پر قبضہ کر کے آباد ہو جاتے ہیں تو اسے بعد میں قانونی درجہ دینا ہے اس طرح سے پبلک ایجنسیوں کے ملازمین اور سیاستدان حکومت کے درآمد کو استعمال کر کے بھی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً یہ حقیقت ہے کہ شہر اپنی کی سرکاری کے بلیر کوئی بھی کسی پلاٹ پر تیار ہو کر قابض نہیں ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ اجازت کسی پلاٹ قبضہ یا سیاستدان کے ذریعہ حاصل کراتے ہیں جس کے ہرے میں سیاستدان دوشہ اور سیاسی مہیت کو حاصل کرتا ہے اور اکثر ان سے مالی فوائد بھی حاصل کیے جاتے ہیں۔

اس حصہ میں میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کم آمدنی والی باتوں کیسیوں میں جو کراچی کے لئے تھیں یا تو ان کی منصوبہ بندی سرے سے تھی ہی نہیں اور اگر تھی تو بہت معمولی۔ دفتری کارروائیوں کی ایجنسیاں غیر ضروری باتوں پر زور دیتا اور ہر مختلف شعبوں میں کسی قسم کا مدد نہ ہوتا ان سب کا فائدہ سیاستدانوں، مقامی لیڈروں اور الزام کو ہوا۔ اور انھوں نے سرپرست و دفنی کا ایک ڈھانچہ تیار کر لیا کہ جو ایک دوسرے کے فائدے کے لئے کام کرتا ہے۔ حکومت کی ایجنسیاں جب منصوبوں کو نافذ کرنے میں ناکام ہو گئیں تو وہ اس پر مجبور ہو گئیں کہ وہ سرپرست اور سیاستدانوں کے مشوروں پر عمل کریں۔ لیکن جیسا

کہ ہم نے نشان دہی کی ہے یہ سرپرست مسائل کو حل کرنے میں کوئی دیکھی نہیں جیتے۔
کیونکہ اگر مسائل حل ہو گئے تو ان کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔

کئی آبادیوں میں رہنے والے لوگ لہذا و یہودی کی متالی معاشق اور ان کے بیڑوں
کوئی حزام نہیں کرتے۔ خوب لائون کے رہنے والوں سے جس نے بہت چیت کی تو کٹر
ہے ان جماعتوں کو یہ کار اور لا حاصل تھی اور اکثر نے کہا کہ ان کے لیڈر صرف پیر
کھانے کے لئے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کے خیالات میں صداقت ہے۔

سب سے پہلے تو ایسی جماعتیں اکثر محض کلف پر ہوتی ہیں اور ان کے نام اس قسم
کے ہوتے ہیں "لائل بورڈ" یا "لائل کمیٹی" حالانکہ انہیں مقامی آبادی کی جماعت ہونا
چاہئے۔ ان کے اراکین کی تعداد بھی کم ہوتی ہے اور یہی حال س کے کام کا ہے۔ ان کے
مردمے وادوں کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ لوگوں میں ایک خاص مقام
حاصل کر سکیں۔ جماعت میں تنظیم و منصوبہ بندی پر تو بہت زور ہوتا ہے۔ مگر اس پر عمل
بست کم ہوتا ہے۔ اس لئے دورانی جماعتیں جتنی ہیں۔ اور ختم ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک
مردمے کے ذریعہ چھ چار ۳۵ فیصد کوئی کام نہیں کرتی۔

ایسی جماعتیں صرف نسل گردہوں تک محدود ہوتی ہیں اور بہت زیادہ کامیاب جماعتیں
بھی آبادی کے ایک حصہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ پھر ان جماعتوں میں زبردست متاد ہوتا
ہے اور دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثر ایک جماعت دوسری جماعت کی سرگرمیوں کو روکنے میں اپنی
زمانی ختم کر دیتی ہے۔ اس مقابلہ کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان جماعتوں کی پہنچ ان ذرائع
تک نہیں ہوتی کہ جو آبادی کی ترقی کے لئے ہیں۔ دوسری طرف ان لیڈروں کے ذاتی
مقادات ہوتے ہیں۔ وہ وہ اس کوشش میں مصروف ہوتے ہیں کہ کسی طرح سے پہلے کے
ذرائع پر قابض ہو جائیں کیونکہ اس اجارہ داری کے بعد ہی وہ اپنی سرپرستی کو قائم رکھ سکتے
ہیں۔

جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے اگر ان بیڑوں کا انتخاب ہوتا ہے تب بھی لوگ
پسے امیدواروں کو منتخب کرتے ہیں کہ جو دیگر ہیں۔ اس لئے یزد و شب کے لئے ان
خصوصیات کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان بیڑوں کے مقادات اکثر
تہادی کے مقادات سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر حکومت یہ اعلان کرتی ہے کہ کئی
آبادی کو قانونی درجہ دینا چاہئے اور مکانات اور چالوں کو ان کے رہنے والوں کے نام یز کر
دیا جائے تو اس وقت لیڈروں اور آبادی کے مقادات میں تضاد نظر آتا ہے کیونکہ یہ لیڈر

بڑے بڑے پلٹ پر بعد کئے ہوئے ہوتے ہیں یا کئی پلانوں کے مالک ہوتے ہیں۔ لہذا ان کی
کوشش ہوتی ہے کہ ہر ایک فیس کم سے کم ہو اس طرح یہ یز اور ترقیاتی مقادات کو پیچھا
کھینچ کر اپنے ہیں اس طرح سے وہ ایک طرف تو دونوں کو پیچھا کر کے آبادی پر اپنے اثر
کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ترقیاتی پروگرام کو کھنوں میں تقسیم کر کے وہ
ایک ہی مرد تک اس مسئلہ کو آہستہ آہستہ نکالنے کی اپنی سیاست چکاتے ہیں۔

مقامی بیڈر بھی سیاستدانوں کی طرح سے عمل کرتے ہیں وہ منصوبہ پر عمل کرنے
کے بجائے خود خود کوڑا کر کے لوگوں کو دیتے ہیں اور ان میں یہ احساس پیدا کرتے ہیں کہ
یہ ان کا حق نہیں بلکہ یہ لیڈر کی مہولی ہے کہ انہیں کچھ مل گیا ہے۔ ان بیڈروں کی طاقت
کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کا رابطہ اور پہنچ وہاں تک ہوتی ہے کہ جہاں ترقیاتی منصوبوں کو
بلا جا رہا ہے وہ اس کے لئے چہرہ منور یا سیاہ ہے کیونکہ ان منصوبوں کو کسی خاص
قائدے کے تحت نہیں چلا جاتا اس لئے یہ وہاں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہیں۔

مقامی آبادی میں لوگ اپنے سرپرست کے اس وقت تک جھکنا رہتے ہیں جب تک کہ
ان کے پلٹ کو قانونی درجہ نہ مل جائے اور جب تک کہ انہیں جمادی سوتیس میں نہ گزری
جائیں۔ چونکہ فکر شای تک یہ لوگ پہنچ رکھتے ہیں اور عام آدمی تمام قوانین اور طریقوں
سے ناواقف ہوتا ہے اس لئے اس کے پاس سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ ان
ایجنٹوں کے ذریعہ اپنا کام کرے۔

جیسا کہ ہم نے تیار صورت حال یہ ہے کہ لوگ ان لیڈروں پر کوئی بھروسہ نہیں
کرتے بلکہ انہیں انہی اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہ کسی طرح سے ان کا اتصال کرتے
ہیں۔ لیکن مجبوراً سب کو ان کے لئے اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ یہ بھی وہیں میں رکھنا
چاہئے کہ یہ وہاں مکانات کے معاملات کے علاوہ دوسرے کاموں میں بھی مدد کرتے ہیں مثلاً
ملازمت دینا ہو یا بچہ کو اسکول میں داخل کروا ہو یا اسپتال میں معاشق کی ضرورت ہو
اور یا پیس سے مثلاً جو اس لئے عام لوگوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان سے اچھے
تعلقات رکھیں اگرچہ وہ بھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ان کے ساتھ دھوکہ کرتے ہیں ان
سے مدد میں پیسے وصول کرتے ہیں مگر برعکس انہیں تحفظ چاہئے اور ان کے اچھے ہونے
کاموں کو پورا ہونا چاہئے۔

اس صورت حال کا اندازہ ایک مردے رپورٹ سے بخوبی ہوتا ہے کہ جس میں ایک
مساں کا جواب دیتے ہوئے اکثریت نے کہا کہ بیڈر کو امیر اور پاؤ ہونا چاہئے کہ حکام

اٹا سے اس کے اچھے تعلقات ہیں اور وہ لوگوں کو خدمات پر دبا کر رکھے لیڈر اور عام لوگ صرف اس وقت حصہ ہوتے ہیں جب کہ ان دونوں کے مقدمات کسی صورت حال میں ایک ہو جاتے ہیں مثلاً اس صورت میں کہ تباہی کے وجود کو خطرہ ہو اس کی مثال "ہیڈرو ل" کی ہے یہ کراچی شہر کی پہلی آبادی ہے کہ جسے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بسایا گیا تھا اور اس میں UNDP نے تعاون کیا تھا اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے "انسانی آبادکاری کا یہ تجربہ" اس علاقہ میں کیا گیا کہ جہاں کے غریب لوگ تجربہ کے مرحلہ سے دور چائے تھے اور اپنی رہائش کا مجموعی طور پر حل نکال چکے تھے

لہذا سرکاری عہدے داروں نے اس بات پر زور دیا کہ ان غیر قانونی آبادیات کو درمی طور پر ہٹایا جائے کیونکہ اس کے بغیر حکومت کم آمدنی والوں کے لئے کیے رہائش پیدا کرے گی؟ کے۔ ڈی۔ اے نے تبادلات ہٹانے کے لئے ایک ٹیم بھی "انہوں نے فوری طور پر مکانات کی چند تعداد کو ڈھلایا اور چن کام دوسرے دن کے لئے چھوڑ دیا۔ راست کو تباہی کے لوگوں کی ایک میٹنگ ہوئی اور یہ سوچا گیا کہ اس سلسلہ کو کیسے روکا جائے؟ چنانچہ حل یہ نکالا گیا کہ اسی رات کو انہوں نے ان مکانات کے ساتھ ساتھ قبریں ماریں کہ جنہیں دوسرے دن گرہا جائے والا تھا جب حسب معمول کے ڈی اے وائس آئے تو انہوں نے اپنے راستے میں قبرستان پیدا اور چونکہ قبر کو برابر کرنا لازمی اور ثالثی طور پر ہے اس لیے "لہذا وہ واپس چلے گئے

اگرچہ کے ڈی اے وائس کو معلوم تھا کہ یہ قبریں جعلی ہیں (جب مقامی آبادی والوں کو اندازہ کیا تو انہوں نے کہا کہ انہیں "کے ڈی اے" پر بھی ماس کی قبرستان (ان) مگر انہیں یہ بھی احساس تھا کہ "تباہی والوں نے انہیں مضبوط کر لیا ہے" اور ان کے لئے مکانات کو سہارا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ بعد میں اس مسئلہ پر کراچی انتظامیہ نے طویل بحث کی اور آخر میں یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ قبرستان کو چھوڑنا خطرناک ہے اور اس سے امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو گا لہذا بیسویں ا کے منصوبہ کو اس طرح سے نافذ کرنا چاہئے کہ قبرستان دور اس کے قریب سے غائب کر دیا جائے اور انہیں اس طرح سے رہنے دیا جائے

اس بات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لوگوں میں یہ مصلحت ہے کہ وہ حصہ ہو اور سوغہ طور پر عمل کر رہے ہیں اور حکام والا کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ پھر اپنے اوکے شہر شدہ منصوبہ کو تبدیل کریں کوئی معمول کارنامہ نہیں اس قسم کے اور بھی واقعات ہیں جن سے جانتے ہیں ان کا عام پسو یہ ہوتا ہے کہ یہ غالی ہوتے ہیں اور ان میں

حکومت جیسے منصوبوں پر عمل نہیں ہوتے وہ چاہا "مگر یہ مطالبہ نہیں کیا جاتا کہ ان کو بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ اس قسم کے معاملات میں لیڈروں اور لوگوں کے مفادات ایک ہو جاتے ہیں

مقام میں اس باب کی نشان دہی کی گئی ہے کہ کراچی میں کم آمدنی والوں کے مکانات کے سلسلہ میں یہ منصوبہ بندی کی گئی اور وہ جس انتشار کا شکار ہوئی "وہ کسی سازش کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی حادثہ قی ہے" بلکہ یہ انتشار اس لئے ہے کہ اس میں ان تمام لوگوں کا اتحاد ہے جو اس کے ذریعہ اپنے اثر و رسوخ کو قائم رکھنا چاہتے ہیں

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عام لوگوں میں یہ مصلحت موجود ہے کہ وہ اپنی رہائش کے مسئلوں کو خود حل کر سکیں بلکہ ان میں یہ مصلحت بھی ہے کہ حصہ ہو کر کام کریں "انہیں اس کا بھی بخوبی احساس ہے کہ ان کا کس طرح سے استعمال کیا جاتا ہے اور مکانات کی رہائش ہے لیکن ان کا لیڈروں کے پنجہ سے نکلنے سے انہیں نہیں کہ ان

میں سے یہ مصلحت ہے کہ وہ مل کر سماجی تحریک چلا سکیں۔

میں سے اس نظام کا لوگوں کے اتحاد پر بھی اثر ہوتا ہے۔ بدلتا رہتا ہے۔

میں پر عمل رہا ہے۔ "پسندیدہ اور مناسب" وہ لوگوں کا اتحاد نہیں رہتا۔

کیونکہ اس سے اس کے وجود کو خطرہ ہوتا ہے۔ "سرکاری کے مقام پر ہوتا ہے۔" لوگوں میں یہ مصلحت ہے کہ وہ مل کر سماجی تحریک چلا سکیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سرکاری کا نظام دیواروں سے پیدا ہوتا ہے: "میں نے یہ سیکھ لیا کہ انھوں نے (خاص طور سے رہائش کے لئے زمین) اور وہ وسیع سطح پر حکومت کے شعبوں "عہدے داروں اور لوگوں کے درمیان ہے۔

لہذا سرکاری کے نظام کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جیسے جیسے یہ دیواروں کو قانونی درجہ دیا جائے اور انہیں بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں "یہ وہاں اب کراچی اور دوسرے بڑے شہروں میں چل رہا ہے۔ مقامی آبادی کے لئے یہ بہتر ہے کہ حکومت کی دیواریں مقامی بنیادی "میں نے یہ سیکھ لیا کہ انھوں نے (خاص طور سے رہائش کے لئے زمین) اور وہ وسیع سطح پر حکومت کے شعبوں "عہدے داروں اور لوگوں کے درمیان ہے۔

مقامی آبادی میں کوئی رابطہ نہ ہو وہاں بھی مقامی جماعتیں بڑھ کر کام کریں "لوگوں میں شعور کی کمی نہیں بلکہ لوگوں میں معلومات کی کمی اور یہی ہلکے روائع تک پہنچنے کی مشکلات خاص وجوہات ہیں کہ جو ان کو مقامی لیڈروں کا محتاج بناتی ہیں کیونکہ یہ استدلال ان روائع پر قبضہ کر کے انہیں اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں اگر مقامی آبادی کو

قانون میں بہتی کے رہنے والے اور حکومت و سیاستوں شامل تھے۔
 دیکھا جائے تو عام تشدد نظم سے تمام کی بستیوں غیر قانونی ہیں۔ اور چونکہ یہ غیر قانونی
 ہیں اس لئے یہ ضرورت پڑھ جاتی ہے کہ ان کو منظم کیا جائے اور حکومت کی ہر اس
 کوشش کو رد کیا جائے کہ جس کے درجہ رہیں۔ ہمارا کرنا چاہتی ہے۔ ہستی کی تنظیم میں
 اس وقت کی آجاتی ہے کہ جب حکومت اسے کسی نہ کسی شکل میں منظور کر لیتی ہے۔ میں
 اس کتب پر بعد میں روشنی ڈالوں گا۔

اگر کچھ سٹیوں کے بارے میں تحقیق کی جائے تو یہ دو قسم کی ہوتی ہیں اور اس لحاظ
 سے ان کی اپنی تنظیم ہوتی ہے۔ ہمارے موضوع کا تعلق اس سے ہے۔

پہلی قسم کی بستی : ہموار ترقی

سب سے پہلے تو اس قسم کی بستیوں ہوتی ہیں کہ جو چانک دھود میں آجاتی ہیں اس
 صورت میں تو ہمارے بہت لوگ کسی ایک جگہ پر بھٹکیاں ڈال بیٹھے ہیں (اکثر یہ زمین دریا کے
 کنارے یا ریلوے کی سڑکوں کے ساتھ ہوتی ہے) مگر اس میں (شہر) کی آمد آمد تھک رہی ہے
 بھی ہوتی ہے) اس بستی کے لوگ شروع ہی سے قحطی حسیہ اختیار کرتے ہیں اور حکومت
 کی ہر اس کوشش کو جس سے ان میں اصلاح یا جملہ کامیاب نہ رہتے ہیں اس
 لئے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بلا کر اس جگہ آباد کرتے ہیں تاکہ زیادہ تعداد کی وجہ سے اس
 کا تحفظ ہو سکے۔

ایک مرتبہ جب وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ وہ جہاں بھی رہیں اس کی
 ہمارت ہے تو پھر ان کی دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ بیماریوں کے لئے صحابہ
 نہیں (اس میں بہت صحابہ ہیں) ہوتا ہے) اس صورت حال میں ایک مسودہ غیر
 زیادہ سے زیادہ بستی کے لوگوں کی شرکت ضروری ہوتی ہے۔ ایک منظم میں اپنی
 شرکت اس وقت کر لیتا ہے کہ جب وہ غیر قانونی طور پر زمین حاصل کر لیتا ہے
 اس قسم کے واقعات سب کو معلوم ہیں کہ یہ سب سب سے پہلے سے رازدار ہیں
 میننگ کرتے ہیں اور پھر اسے منسلک کر لیتے۔

ایک مرتبہ جب یہ اعلیٰ کاغذ میں منسلک ہو جاتی ہیں تو اس کے ساتھ ہی تنظیم میں بھی کوئی کام نہیں آتا۔ اس میں کوئی منظم نہیں
 حاصل رہتا۔ سب سے پہلے یہ ہے کہ اس میں کوئی تنظیم اس وقت زیادہ

اچھلتی ہے۔ یہ حکومت ان بستیوں کو قانونی درجہ دینا چاہتی ہے تاکہ اس کے درجہ سے
 ہر ایک کو معاوضہ یا عائلے اور زمین کی قیمت نہیں اور سولہوں کے بارے میں بعد کیا
 جائے۔

دوسری قسم کی بستی : ابتدائی اور تجزوی ترقی

یہ دوسری قسم کی بستی شہری حدود پر نمودار ہوتی ہے جہاں دلال اور انجمن حکومت
 سے اس کی منظوری پتے ہیں۔ یہ اس قسم کی منظوری ہوتی ہے کہ اگر خاص شرائط کے
 ساتھ وہ زمین دریا کے سے تقسیم کر دیں تو کسی پریشان نہیں کیا جائے گا۔ ان شرائط
 میں اسیروں اور دوسری زمینوں کو رشتہ دینا وغیرہ شامل ہوتا ہے۔

اس صورت حال میں "دوسری آدمی" سے غیر سرکاری طور پر حکومت کی سرپرستی
 حاصل ہوتی ہے۔ وہ بستی کے لوگوں کی تنظیم بناتا ہے اور ان کو متحد کرتا ہے۔ "دوسری
 آدمی" ہی بستی کی بنیاد رکھتا ہے افراد کو جماعت دیتا ہے۔ پانی اور ٹرانسپورٹ کی سولہوں
 فراہم کرتا ہے۔ بستی کے لوگوں کے لئے اس درمیان توئی ہی کی سرپرستی ممانعت ہوتی ہے
 کیونکہ ان کے پاس نہ تو پلٹ کے کاغذات ہوتے ہیں اور نہ قبضہ کی کوئی قانونی دستاویز

اس کے نتیجے میں بستی کے رہائشی پسر لوگوں کی تنظیم میں شہریت ان کی کمزور ہوتی ہے
 یا نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ دوسری آدمی یا اس کے مدگرمہ پانڈ افراد کا ٹیڈا بستی کے
 لیڈر بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کی پہلی حکومت کے درمیان تک ہوتی
 ہے۔ اگر بستی میں سیاسی جماعتیں بھی بنتی ہیں تو ان کا وجود "دوسری آدمی" اور اس کے
 حراموں کا موجود صحت ہوتا ہے۔

بستی کے رہنے والوں کے مقاصد

چاہے بستیوں کی قیام کی ہوں اور چاہے ان سے رہنے والے کسی طرح کے ہوں
 لیکن ان کے مقاصد ایک ہی ہوتے ہیں۔ جو کہ یہ ہوتے ہیں:
 ۱۔ حق ملکیت حاصل کرنا۔

۲۔ کچھ مادی سولہوں حاصل کرنا۔

۳۔ حق ملکیت اور سولہوں کے لئے کم از کم لواٹنگ

یہ بستیوں ضروریات ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں اور بستی کی زندگی میں ہر مرحلہ

ایک دوازن کو پھاڑا کرتی ہیں۔ جب سستی میں لیاوی سوتیلیں بالکل بند ہوں، یا بہت کم ہوں تو سستی کے رہنے والے ن کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ پیچھے دھبے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب سستی میں بہت سوتیلیں آجاتی ہیں تو اس کو حکومت کی جانب سے یہ اشارہ بھیجا جاتا ہے کہ وہ سستی کو قانونی درجہ دینے پر تیار ہے اس سے تحفظ کا احساس پیدا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اورنگی کی خواہش بھی کم ہو جاتی ہے۔

اس ضمن میں ان سیویں میں بہت سی سواریاں ہیں۔ درجنوں کی رتی جڑوی ہوتی ہے، فرق اہم ہو جاتا ہے، عام طور سے ان بستیوں میں کہ جہاں ترقی ہو رہی ہو وہاں پر لوگوں کو دوسری بستیوں کے مقابلہ میں بڑے حاصل کرنے کی خواہش پیدا جاتی ہے۔ لہذا ہموار ترقی والی بستیوں میں اورنگی کا رجحان بھی زیادہ ہوتا ہے دوسرے ان بستیوں میں رہنے کی سہ ہادی زیادہ نہیں ہوتی اور یہاں پر بالکل پر لوگوں کی توجہ ترقی والی سستی کے مقابلہ میں زیادہ منظم ہوتی ہے۔ یہ تمام حالات اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ان بستیوں کو قانونی درجہ حاصل کرنے اور سوتیلیں حاصل کرنے میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

حکومت کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ جڑوی طور پر ترقی کرنے والی بستیوں پر زیادہ توجہ دی جائے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی نشان دہی اس مقالہ میں دوسری جگہ کی جائے گی۔

بستیوں کی ترقی کے عمل میں حکومت کی شرکت آہستہ آہستہ بڑھتی ہے جس کا اندازہ ن کو دی جائے۔ دلی سوتیلیوں سے ہوتا ہے۔ ان کو قانونی درجہ دینا سستی کی زندگی میں حکومت کا آخری قدم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد سستی کبھی آبادی نہیں رہتی بلکہ قانونی درجہ کا قانونی آبادی ہو جاتی ہے کہ جس میں حکومت کی شرکت سرکاری طور پر سونپ دیا جاتا ہے اس وقت جب کہ سستی کو قانونی درجہ دینے کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو اس وقت سستی کے لوگ اس مرحلہ پر ہوتے ہیں کہ جہاں انہیں نہیں ہونا ہے کہ انہیں کسی صورت میں سہہ داخل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس مرحلہ پر قانونی حد تک سوتیلیں حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ اس لئے تینچیا یہاں پہنچ کر قانونی طور پر اورنگی کی خواہش بہت کم ہو جاتی ہے۔

ان معاملات میں قانونی حیثیت کا مطلب ہوتا ہے کہ موجودہ صورت حال کو تسلیم کر لیا جائے اگرچہ یہ ایک نیک منظوری ہوتی ہے کہ جس کے کوئی سستی نہیں ہوتے لیکن وہ سستی والوں کے لئے جی جیتی ہوتی ہے ان حالات میں سستی کے رہنے والے صرف اس وقت اورنگی پر تیار ہوتے ہیں کہ جب یہ قانونی حیثیت کے ساتھ ساتھ انفرادی سطح پر (والا)

دھانچہ) میں بستی کے اقدامات کئے جائیں، یا لیر کی فیس معصوم ہو اور اس کی اورنگی کا طریق کار سادہ ہو اگر آخری طریقہ کار اختیار کیا جائے تو قانونی حیثیت کے بعد سستی کے لوگ قانونی طور پر توکل گورنمنٹ پر ہوا ڈال سکتے ہیں کہ وہ انہیں بغیر کسی ایک فیس کی اورنگی کے تمام سوتیلیں مہیا کرے، کیونکہ قانون کے تحت یہ سوتیلی کی رسد دہانی ہے کہ وہ قانونی سطح پر رہ سکتے۔

ایک دوسرا عنصر جو سستی کے رہنے والوں کی ضرورت یا اس ضرورت سے نکل کر انہیں متحرک کر سکتا ہے وہ سستی کو قانونی درجہ دینے کا ہے۔ جب تک سستی غیر قانونی ہوتی ہے اس وقت تک وہاں پر زمین کی قیمتیں کم ہوتی ہیں۔ کیونکہ غیر قانونی زمین کی تجارت کم آمدنی والے لوگوں میں ہوتی ہے۔ لیکن جب سستی کی قانونی حیثیت ہو جاتی ہے تو وہ کسی شکل میں ہو تو زمین کی اور زیادہ آمدنی والے لوگ مارکیٹ میں مقابلہ پر تیار ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں قیمتیں بڑھنا شروع ہو جاتی ہیں اور قیمتوں کا یہ بڑھنا خاص ہوتا ہے۔

حقیقت ہے کہ یہ سستی کے رہنے والوں کے مفاد میں ہوتا ہے کہ ان پلاٹوں کی قیمتیں بڑھیں، لیکن کم حالات میں وہ فوری طور پر اپنے منافع کو نقدی کی صورت میں وصول کرنا نہیں چاہتا۔ وہ اگرچہ اس پر فخر اور خوشی محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک پلاٹ کا مالک ہے لیکن اس کو بھی معلوم ہے کہ دوسرے پلاٹ کی خریداری میں اسے اتنے ہی پیسے دینا ہوں گے اس کا فوری منافع اس میں ہوتا ہے کہ سستی اور معاشی طور پر قانونی مالک بن کر اور تازہ ذرے سے آزاد مالک اس کے پاس ہو جائے۔ چونکہ یہ منافع فوری طور پر ظاہر نہیں ہوتا، اس لئے سستی کے رہنے والے کو اس میں دلچسپی ہوتی ہے کہ پلاٹ کتنے منگے ہو جائے (اور وہ اسے حاصل نہ کر سکے) ایک مرتبہ جب سے بے رخی کا ڈر نہیں رہتا تو پھر اس کی ترجیحات میں سوتیلیوں کا مطالبہ ہوتا ہے۔ ایک عرصہ سستی کا رہنے والا جب مالی مشکلات کا شکار ہوتا ہے تو وہ پلاٹ بیچ کر اس کی قیمت وصول کرنے پر تیار ہو جاتا ہے، یہ قیمت اسے ملے مالک روگ دینے پر تیار ہوتے ہیں اس طرح آگے چل کر قانونی اور بہتر سوتیلیوں دلی سستی آہستہ آہستہ متوسط درجہ کے لوگوں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔

وہ "دوسری آدمی" ہو کہ دوسری قسم کی بہتی رہتا ہے وہ پھر وہاں تکسٹیم بناتا ہے، اس کا کیس ذرا مختلف ہوتا ہے۔ ابتدائی طور پر وہ دلاں سے دلاں پر پلاٹ بیچ دیتے ہیں لیکن اس کا خدشہ دیکھتے ہیں کہ وہ کئی پلاٹ اور خاص طور سے کمرشل پلاٹ ہو کہ مرکز کے سامنے ہوتے ہیں انہیں دلی رہیں کیونکہ ایک بار جب یہ سستی آباد ہو جاتی ہے تو یہ پلاٹ

بست بنتے ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ محض ایک مٹ باری ہوتی ہے۔ لیکن اس مٹ باری میں وہاں کو یہ دلچسپی ہوتی ہے کہ ہستی کو قاضی درجہ سے لے کر تک اس کے ساتھ ہی مٹ باری کا نتائج پیدا ہوتا ہے۔ ان دلائل کی ہم بعد میں وضاحت کریں گے کہ کیوں قانونی وجہ کے ساتھ سولوں کے حصول میں زیادہ دلچسپی نہیں دیتے ہیں۔

ہستی کے رہنے والوں کے ادارے

ایک عام ہستی کا رہنے والا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ عجیب ٹوی ہوتا ہے۔ اس بدلتا ہوا اس سے لگاؤ یا سکا ہے کہ ہستی کے رہنے والوں کا نہیں چاہئے جس سے اس پر مشغول ہوتا ہے جو غیر بشر منہ جڑواں 'ریج کی دالے' (بڑی لگا کر بیٹھے دالے) ہستی کے پھولے درگاہوں کا طالع ہوتے ہیں۔ اس لئے واضح طور پر یہ کم آمدنی والے لوگ ہوتے ہیں اور ان میں بہت کم مس بات کی اہمیت ہوتی ہے کہ اپنے مسائل پر بہت حیرت کر سکیں۔ اس سے ان کے لئے ہمسایوں کی اپنی حیثیت کے مطابق حکومت سے تحفظات در سوتیلیں حاصل کر سکیں۔ اس سے پہلے ہم نے دو ہستیوں کے فرق کو واضح کیا ہے لیکن چاہے ہستی کے فرق کچھ بھی ہو 'اس کے لیڈر' راہنما اور ترجمان وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کی پہنچ عکسیتی اور دلیں تک ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ وہ زیادہ تعلیم یافتہ 'پیسے والے' اور عام ہستی والوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ عام ہستی والوں کے صحیح طور پر فائدہ نہیں ہوتے ہیں 'اور ان میں سے اکثر کا تعلق اونچے طبقوں سے ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ہستی والوں کے صحیح فائدے کو نہیں سمجھتے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے چروکاروں کے مفادات کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے کیونکہ نظریاتی اور حقیقت میں یہ مفادات ایک بھی ہو سکتے ہیں۔ کراچی کی ہستیوں میں تمام پہلے ہونے نظام میں سرپرست و گاہک کا رشتہ ہے۔

سرپرستی کی شکل ایک ادارہ بندی ہو سکتی ہے 'اگرچہ یہ غیر رسمی ہوتی ہے' اور اس میں وہ اشخاص کے درمیان کاروبار ہوتا ہے۔ یہ وہ اشخاص اپنے مفادات اور دلچسپیوں کے اعتبار سے جدا ہوتے ہیں 'اس کاروبار میں سرپرست اپنے اثر کو دوسری پارٹی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس کے بدلے میں اس کی اپنے سرپرست کے مفاد کے لئے ہر قسم کی خدمات پیش کرتا ہے۔ اس لئے ایک ہستی کے لیڈر کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ ایک ایسا شخص جو اپنے اثر اور طاقت کو استعمال کرتا ہے اور جس کی عکسیتی میں پہنچ ہوتی ہے کہ جہاں فیصلے

کئے جاتے ہیں۔ ایک رہنما کی فطرت ہوتی ہے کہ اس کے ذاتی محرکات اور مفادات کچھ بھی ہوں وہ ان کو قانونی حیثیت دیتا ہے

ان لیڈروں کے مفاد کیا ہوتے ہیں؟ ان دلیں راہنماؤں کا جو دوسری قسم کی ہستیوں میں رہتے ہیں 'ان کا خاص مقصد مٹ باری کا ہونا ہے' لیکن کسی حد تک یہ پہلی قسم کی ہستی کے راہنماؤں کے لئے بھی صحیح ہے جو کہ پیسے والے اور طاقتور ہوتے ہیں اور جن کے ہستی میں کئی پلٹ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے لیڈروں اور عام ہستی کے رہنے والوں کے مفادات جڑواں طور پر ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ مسرتیز حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کا رویہ میں سرپرست و گاہک کے دشتے اہم کردار ہوا کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ہستی کے رہنے والے سوتیلیں حاصل کرنے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی رہائش کا تحفظ خود بخود ہو جاتا ہے۔ لیڈر اپنی پابندی کا قانونی درجہ دیتے اور سوتیلیں کو علیحدہ علیحدہ کر دیتے ہیں 'کیونکہ ان دو چیزوں کو علیحدہ کرنے کے بعد ہر قسم کے ریت کم ہو جائے ہیں اور بحریہ دہاؤ کے درجہ ضروری سوتیلیں کے حصول پر توجہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک مستطیل ہے' لیکن اس طرح سے وہ اپنی طاقت کو عمل درآمد کرتے ہیں 'یہ عدالت سنی کے تے والوں سے تمام مقاصد پر سے ہو گئے تو پھر ان کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ مثلاً دلال کیونٹی اور قومی مفادات کو علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھا ہے اور ان کے درمیان مفادات کو حل کرتا ہے۔ یہ ان کے مفاد میں نہیں ہوتا کہ وہ مسرتیز کو حل کریں 'کیونکہ اس طرح سے وہ اپنی افادیت کو بے یقینی کرے۔ اس لئے اکثر وہ ہستی اور حکومت کے درمیان رابطہ کا کام کرتے ہیں اور اس کھلاؤ کو باقی رکھتے ہیں کہ ان کے عمل کو فعال بنانا ہے۔

ہستی کے لیڈروں کا ایک پہلو اور بھی ہے 'جو نرمی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے' کیونکہ لیڈروں میں باہمی طور پر سخت مقابلہ ہوتا ہے اور ایک ہی ہستی میں کئی لیڈر اپنے مفادوں کے ساتھ کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی جہاں تک ممکن ہوتا ہے طاقت کرتے ہیں 'اس سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لیڈر کس حد تک لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

حکومت: درجہ بندی، منصوبہ بندی کے ساتھ انتشار، نوکر شاہی کا ایک الجھاؤ والا کیس

ہستی کی بندوبست کی طرح لوکل گورنمنٹ میں زیادہ درجہ بندی کا شمار ہوتا ہے۔

کراچی میں مقامی سطح پر تقریباً ۱۰ حکومتی اور نیم حکومتی ادارے ہیں۔ جو منصوبہ بندی اور عمل درآمد پر کام کرتے ہیں جن میں پبلک ورکس، تنصیبات کی تعمیر اور مقامی ترقی و ترقیاتی منصوبہ بندی شامل ہے۔ ان ایجنسیوں کے درمیان بہت کم رابطہ ہوتا ہے بلکہ ہر ایجنسی اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ اپنی مختلف خود تخلیق کردہ منصوبہ بندی کے تحت وہ سرے شرکت کریں یا جزوی طور پر اپنے اختیارات استعمال کریں۔ اکثر ان ایجنسیوں کی حدود اور ذمہ داریاں غیر متعین ہوتی ہیں اور ان کے درمیان باہمی تصادم عام ہوتا ہے۔ ان ایجنسیوں کے اپنے اندر ان کے مختلف شعبوں میں بہت کم رابطہ ہوتا ہے۔

ایک باہر سے آنے والے کو ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے تمام ایجنسیاں جاکھ جاکھ ہوتے ہیں لیکن یہ جو منظر پیش کیا گیا ہے یہ ایک منصوبہ بندی کے تحت ہوا ہے اور اس حد تک کہ کچھ کئی کے طور پر یہ قیاد چا سکتا ہے کہ لائن کمال پر جا کر گم ہو جائے گی۔ اس صورت حال کو جان کر کے لئے میں ایک مثال دیتا ہوں جو کہ ہے تو رہن کی پیاد اور کرکٹ صورت حال کی قیادگی کرتی ہے

فرض کریں کہ کسی لیمار سب میں ۱۰ عددے دار ہیں جو کہ ۱۰ کاریں مشترکہ طور پر استعمال کرتے ہیں اور ان میں سے کہ جو پہلے آئے گا وہ کار کو اپنے استعمال میں لائے گا اس کا سیدھا سا دھار طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ ایک ساوا چارٹ آفس میں کسی مرکزی جگہ پر لگا دیا جائے جس میں میٹروں کے دونوں دروازوں کو دکھایا گیا ہو تاکہ کوئی بھی آخر گاڑی کو اپنے لئے پک کرے۔ اس کے ذریعہ یہ بھی دکھایا جاسکے کہ کون کس وقت کون سی گاڑی کو استعمال کر رہا ہے اور کوئی سی گاڑی موجود ہے

اگر یہ معمول ہو تو ایک کرکٹ کا کام صرف یہ ہو گا کہ کیا ایسی کی ضرورت درست ہے؟ یہ دیکھ کر وہ اسے گاڑی کی چابی اور لاگ بٹن دے دے اور جب انفرادیت آتے تو اس سے دونوں چیزیں واپس لے لے۔ لیکن ٹرانسپورٹ کرکٹ کے لئے اس طرح کے کام میں کوئی ریلنگ نہیں ہوگی لہذا اس کا طریقہ کار یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے پاس سائیکلو اسٹاکل فارم رکھتا ہے کہ جن پر گاڑی حاصل کرے کے لئے مطالبہ کرتا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس فارم میں غیر ضروری قسم کی باتیں پر بھی جاتی ہیں۔ یہ فارم بھرے اور فراپ طریقہ سے سائیکلو اسٹاکل کیے جاتے ہیں اور ان کا ذریعہ کرکٹ کی میز پر ہوتا ہے کہ وہ پار پار چل کے چپے سے بکھرتے جاتے ہیں

لہذا ہمارے طریقہ سے چپے کے بجائے ہمارے مسٹر گزٹ ہو کر رہ گیا جس شخص کے لئے بھی جو اس کا پتہ ہے اس میں کوئی ریلنگ نہیں رہی یہ مسٹر اپنی خرابیوں کے باوجود اگرچہ کام کرے گا مگر اس میں تمام مصلحتیں پر کرکٹ کی اہم داری ہوگی اور وہ قانون کے تحت گاڑی کی چابیاں دینے کے بجائے یہ اختیار کو استعمال کرے گا کہ کس کو دے اور کس کو انکار کرے یہ صورت حال اسے ہم اور صاحب عرت ہائے میں عداوت کی اور جب سے صورت ہوگی تو وہ اسوں سے اس کے بدلے میں رعایتیں طلب کرے گا اور وہ بھی انکار کرنے سے پہلے وہ بار یقیناً سنا جائے گا۔

یہ ہے اس طرح اس قسم سے مصلحتی اداروں میں کیلئے اس سے رجوع کیا گیا ہے۔ مصلحتی اداروں کے ذریعہ اس طرح کے منصوبہ بندی میں اس سے رجوع کیا گیا ہے۔

اس طرح کی تمام مثالیں دیکھ کر اس کی ضرورت کی اسے واضح ہو سکتی ہے۔ اس سے اس کی ضرورت کی اسے واضح ہو سکتی ہے۔ اس سے اس کی ضرورت کی اسے واضح ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد ضروری ہے کہ کچھ باتیں متعین کی جائیں کہ یہ ہونا ہے کہ اس طرح سے منصوبہ بندی سے کچھ نفع ہوگا اور کچھ نقص ہوگا۔ اس کے بعد ضروری ہے کہ کچھ باتیں متعین کی جائیں کہ یہ ہونا ہے کہ اس طرح سے منصوبہ بندی سے کچھ نفع ہوگا اور کچھ نقص ہوگا۔

۱۔ پاکستان میں حکومت کا جو نظام قائم ہے وہ اس اصول پر ہے کہ انتظامی معاملات میں منصوبہ بندی اور اس عمل درآمد کی پالیسی دواور مینجمنٹ ہیں۔ پاکستان نے جو ایک مضبوط ریاست وراثت میں پائی ہے اس کے تحت یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ صرف سرکاری ملازمین کے ذریعہ ہی انتظامی امور بہتر طریقہ سے سر انجام دیے جاسکتے ہیں اس اصول کا اندازہ چشمہ دراند اور سرسبز تانہ ہوتا ہے اس کا سیدھا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ قومی اداروں انتظامی طور پر عمومی انداز کے اصول کے ماتحت ہوتے ہیں اگرچہ قومی سطوح سے یہ بہتر ہوتے ہیں

۲۔ اس قسم کا مسلم بن گیا ہے کہ جس میں اہم انتظامی حدود پر اسوں کے چاروں طرف سے ہوتے رہتے ہیں اس وجہ سے اسوں اور ان کے ممبروں کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے

برحال یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں انتشار ایک منصوبہ بندی کے تحت پیدا کیا گیا ہے۔ یہ یقینی طور پر اس روایت کے نتیجے میں پیدا ہوا کہ جسے "پہلے ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کیا جا رہی ہے۔ اس پر عمل درآمد اس وقت سب سے زیادہ ہے کہ جب اس نظام کو عمومی نقطہ نظر سے افسر چلاتے ہیں، حکومت کے ملازمین اور عوامی لیڈروں میں سرپرست و موکل (گاہک) کے جیسے تعلقات ہوتے ہیں، اور اس نظام میں کثرت سے تبادلے جملہ داروں کو مختلف شعبوں میں مہارت حاصل کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ پبلک کے ذرائع خصوصی کنٹرول کی وجہ سے حدود دار جس کو چاہتے ہیں فائدہ پہنچاتے ہیں۔ یہ فائدہ اس لئے بھی ہوتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنی طاقت اور مقبولیت کو بڑھائیں۔ اس نظام میں ایک چابھیں اپنے ساتھ افسر کے کارناموں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے جس کی وجہ سے کسی بھی پالیسی میں تسلسل برقرار نہیں رہتا ہے۔

۴۔ اکثر سیاسی تبدیلیاں اور طویل سیاسی بے یقینی انتظامیہ کی قوت کو اور بڑھا دیتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اہم نیٹے کرتے ہوئے محتاط ہو جاتے ہیں۔

۵۔ ایسے ادارے جو سہائی کا کام کرتے ہیں وہ کمزور ہیں۔

۶۔ اکثر افسروں کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں۔

ان نکتوں کے پیش نظر (جس پر دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ عمل صحیح ہیں) میں نے صرف اہم رجحانات کی طرف اشارہ کیا ہے، کچھ آبادیوں میں پالیسی پر عمل درآمد کے بے نتیجہ نکلے ہیں۔

۱۔ بعضی کے رہنے والوں کے خاص حقوق کو تسلیم کرنا (دلائل کا حق، ہستی کی ترقی میں شرکت کا حق)

۲۔ منصوبہ پر عمل کرنے کے لئے باقاعدہ طریقہ کار بنانا اور اسے ایک عظیم شکل دینا (جیسے رہائش پذیر لوگوں کی شمولیت، قرضہ جمع کرنا، لیبر کا سلاخ طریقہ، فٹری ماحول کو بہتر بنانا) یہ دونوں باتیں ان لوگوں کے لئے باعث دلچسپی نہیں کہ جو انتشار سے محبت کرتے ہیں، چاہے ان کی حیثیت الغرادی ہو یا انجینیئر کی۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بعضی کے لوگوں کے حقوق کو واضح نہیں کیا جائے اور نہ ان کی تعریف کی جائے، اور ان کے مسائل کے حل کے لئے ایسی پالیسی بنائی جائے کہ جو ان کی مرضی کے مطابق ہو۔ اس طرح سے تمام اختیارات فرد یا انجینیئر کے پاس جمع ہو جاتے ہیں۔

۳۔ جب چاروں طرف انتشار کی حالت ہو تو اس سے باصلاحیت افسروں کی کوششیں بھی

متاثر ہوتی ہیں، اور وہ اپنی کوششوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حکومتی اور انتظامی اختیارات کے ڈھانچہ میں رہتے ہوئے کچھ کر نہیں سکتے، اور اگر وہ واقعی میں کچھ کرنا چاہیں تو انہیں غیر سرکاری طریق کار کو اختیار کرنا ہوتا ہے مگر اس طرح سے وہ طویل منصوبہ بندی کو پورا نہیں کر سکتے، اس وجہ سے پرانا نظام قائم رہتا ہے۔

انتظامیہ کے اس طریق کار کو جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، اگر اس کا مقابلہ گیر نو کے "ذرائع الجھاؤ" کے ساتھ کیا جائے تو اس سے اس نظام کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ میک کی نے الجھاؤ کی اصطلاح گیر نو سے لی ہے اور اس نے اسے شہر سے تعلق رکھنے والی "بازار معیشت" کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس نے یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ انتظامیہ کے مختلف طریقہ کار لیبر کے اصولوں سے کمری ممانعت رکھتے ہیں، اور یہ اصول بازار معیشت کی عکاسی کرتے ہیں۔ الجھاؤ کے اس طریق کار کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ایک مسلسل عمل ہے جو کہ ایک ایسے نظام کو مسلسل بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے جو کہ تبدیلی کے عمل میں خود کو حالات کے تحت نہیں ڈھل سکا۔ الجھاؤ کا ایک بنیادی نقطہ یہ ہے کہ بہتر تبدیلی کے کمرائی میں چھپا جائے، یا گیر نو کے الفاظ میں "پرانے چلات پر زیادہ محنت کی جائے اور نئے قائم نہ کیے جائیں" یعنی اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے "بہتر تبدیلی کی تبدیلی" ایک ایسا رجحان کہ جو روایتی طریقوں کو تبدیل نہ کرے بلکہ انہیں چلے دار بنا دے یعنی "جمود کی حالت میں پسپاؤ"

الجھاؤ کے عمل کے چار طریقوں کو گیر نو نے اس طرح سے بیان کیا ہے:

۱۔ بنیادوں کا استحکام

۲۔ اندرونی آراء کی رخنہ دہی

۳۔ فنی سرگھٹیاں

۴۔ نہ ختم ہونے والی پاکیزگی

ان خصوصیات کو کمرائی کی انتظامی دشواری پر غیر یقینی حد تک درست قرار دیا جا سکتا ہے، لہذا اس صورت حال میں انتظامیہ کے الجھاؤ پر یوں ٹھیک ہی ہے۔ چپ نے اپنے مقالہ "جمود گاؤں کا کیس" میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح سے انتظامیہ منصوبہ پر عمل کرنے میں ناکام رہی، اور نتیجہ یہ نکلا کہ جس حکومت کے ملازم مزدوروں کی طرح کام کرتے رہے۔ اس کیس میں اس کی تنقید تھی کہ مقامی انتظامیہ پیسے اور وقت کو بچا سکتی تھی، لیکن محنت کے ساتھ پرانی روایات قائم رکھ کر، اور اس طریق کار کو اختیار کر کے کہ

جس میں بد عنوانی کو روکنے کے کئی طریقے ہیں 'مگر بد عنوانی ختم نہیں ہوتی ہے' اس نظام میں اختیارات کے صحیح و غلط استعمال کی بھی نئی ادبیت ہے۔ (مثلاً کسی قاتل کو اس لئے دہائی بیچ کی طرف بھیج دیا کہ اس کا ایک صلہ قتلہ جگہ پر لگا ہوا ہے) اس میں اہم موضوعات پر بحث سے کٹوا جاتا ہے 'اور کام کے نتیجے تو کچھ نہیں ملتے سوائے اس کے کہ افسران اعلیٰ مصروف رہتے ہیں۔

لیز کرانے کا طریقہ جو کراچی میں 'وہ کئی لحاظ سے ناقابل عمل ہے' مثلاً ہر لیز کے سلسلہ میں جو دستاویزات جاری ہوں گی 'اس کا ریوولوشن کارپوریشن پاس کرے گی اور اس پر ایڈمنسٹریٹر کے دستخط ہوں گے 'اندرون آراٹھی' کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ لیز کی درخواست دینے والے کو ایک آئس سے فارم لینا ہو گا لیکن سرکاری اسٹیمپ اسے دوسرے آئس سے ملے گی 'درخواست اس وقت دی جائے گی جب کہ اس پر آئس ہوں 'یعنی سوشلائوں' کو اس طرح سے جان کیا جا سکتا ہے درخواست دہندہ کو کم از کم ۸ مار ایک ہی آئس کے پکر لگانا ہوں گے۔

اس مثل کو 'تحرک شہری' کے لئے 'کے ہوئے' کچھ اہم عناصر کی نشان دہی کی جاتی ہے۔
۱۔ الجھڑ کے عمل کا بنیادی کام یہ ہے کہ اس نظام میں زیادہ سے زیادہ افراد کو کھپایا جا سکے۔

۲۔ نظام جیسا کہ یہ ہے 'اس صورت میں اسے برقرار رکھا جائے۔

۳۔ جس طرح ذرا مٹی کسان نظام اور شہر کی بازار معیشت کی پیداوار ایک دوسرے کی محتاج ہوتی ہے اس طرح سے نوکر شہری کے الجھڑ اور پبلک کے کاسوں مثلاً سیاسی و تجارتی الجھڑوں میں رشتہ ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کی زندگی کے لئے لازمی ہوتے ہیں 'اس لئے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ایک دوسرے پر انحصار کا پہلا ہر شخص کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس نظام میں حصہ لے اور اس کو مضبوط بنائے۔

سیاستدان

اس حصہ میں ہم صرف ان مقامی سیاستدانوں کا ذکر کریں گے کہ جو کچی آبادی کی ترقی کے پروگرام میں حصہ لیتے ہیں۔ ان کا اور بہتی کے والوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ مقامی سیاستدان بہتی کے معاملات میں ذاتی مفادات رکھتے ہیں اور بہتی کے دلائل ان کے موکل ہوتے ہیں 'اکثر بہتی کے دلائل اور سیاستدان ایک ہوتے ہیں۔

مرگرت اور موکل کے نظام میں سیاستدان اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ وہ اپنے موکلوں کو مراعات ملتے 'جیسے اس کے کہ ان کے حقوق کے لئے جدوجہد کرے' اگر وہ آج بہتی کے لئے پبلک ل حاصل کر لیتا ہے اور وہ سری مرتبہ بہتی کی ایک سڑک بننے کرنا دیتا ہے تو یہ اس کے لئے زیادہ بہتر ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ میں اپنے کالوں کو تمام حقوق دلا دے 'کیونکہ اگر انہیں حقوق مل گئے تو پھر وہ اپنے سیاستدانوں کے کم محتاج ہو جائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی سیاستدانوں کی سرگرمیاں عارضی مسوئوں کے حصول کے لئے ہوتی ہیں۔ یہ سیاستدان عام طور پر اس وقت بھی دخل اندازی کرتے ہیں جب کہ حکومت کسی کام کو پورا کر رہی ہوتی ہے 'اس کی ایک مثال لیاری کی ہے 'کہ جو شہر کے مرکز کی ایک بڑی گندی آبادی ہے 'یہاں ۷۰ لاکھ لوگ رہتے ہیں 'اس کو منصوبہ اس وقت پکاؤ کا شمار ہو گیا کہ جب انکیشن سیم کے دوران ایک امیدوار نے پورٹ اور ٹالیاں بچائے ہوئے مجمع میں اعلان کر دیا کہ لیز کی شرح ۳ روپیہ فی مربع فٹ سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس کے بعد یہ فیملی کے لئے یہ فائنل ہو گیا کہ اس سے زیادہ قیمت وصول کر سکے 'اس کے ساتھ ہی یہ بھی فائنل ہو گیا کہ ترقی کے منصوبہ پر عمل درآمد ہو سکے۔ اس لئے آخر کار یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔

عمل درآمد کی فراہمیاں

اوپر ہم نے ہر اس مرحلہ کے مقاصد اور طریقوں کا تجزیہ کیا ہے کہ جو بہتی کی ترقی میں حصہ لیتے ہیں 'اس وقت ہم نے گروہوں کے تعلقات کو بیان کریں گے۔

اس حادث کے تحت دیئے گئے رابطوں کے تحت مندرجہ ذیل کو افہام کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ لیڈروں اور حکومت کے درمیان رابطہ کچھ بھی مسائل ہوں 'بنیادی کتبہ یہ ہے کہ ان لیڈروں 'بہتی والوں اور حکومت کے مفادات آپس میں ملتے ہیں۔ ایک طرف سے تو اس کی وجہ سے ان میں کشمکش پیدا ہو جاتی ہے 'دوسری طرف یہ بھی ہوتا ہے کہ ان

گروہوں میں آپس میں معاہدہ ہو جاتا ہے اور اس معاملہ میں وہ بھرپوری ہستی کے رہنے والوں کے مذاقات کو نہیں دیکھتے۔ وہ ہتھیار کر جن کا دھور بالکل ابتدائی ہوتا ہے وہ اس قسم کے معاہدوں کی اچھی مثال ہیں۔ ایسی ہتھیار حکومت کی جانب سے زیادہ سوتیں اور مزاحمت حاصل کرتی ہیں۔

۲۔ ہستی کے رہنے والوں اور حکومت کے درمیان براہ راست رابطہ نہیں ہوتا ہے، اگرچہ حکومت کبھی کبھی اہم اطلاعات کے لئے ہستی تک جاتی ہے اور ایسا ہی سیاستدان بھی کرتے ہیں ان دونوں صورتوں میں یہ یکطرفہ معاملہ ہوتا ہے۔ اس کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ حکومت کو کیا فی مشکلات ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ لوگوں کی اکثریت تک نہیں پہنچ سکتی، ہستی کے راہنما بھی ان کی بہتر نمائندگی نہیں کرتے، اس کے ساتھ ہی ملجائی فرق بھی واضح ہو جاتا ہے بڑے الزمان حوصلہ طبیعت کی نمائندگی کرتے ہیں، جب کہ ہستی والوں کا تعلق پچھلے طبقوں سے ہوتا ہے۔

اس فرق کی وجہ سے آپس میں پوری طرح سے انضمام و تقسیم نہیں ہو پاتی۔ اس کے علاوہ قانونی درجہ دینے اور سوتیں فراہم کرنے پر ہستی کے رہنے والوں اور حکومتی اداروں میں تعلیم ہوتا ہے اور ان کے درمیان باہمی بد اعتمادی قائم رہتی ہے۔ ہستی کے رہنے والے حکومتی اداروں کو دشمن تصور کرتے ہیں اور ان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ یہ ان کی ہستی کو مسمار کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں، یہ ہمیشہ دغا کرتے ہیں کہ انہیں واقعی سوتیں دی جائیں گی، لیکن ان وعدوں کو کبھی پورا نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس حکومتی ادارے کئی آبادی والوں کو ناجائز قابض سمجھتے ہیں جنہوں نے فی حکومت کی زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے اور حکومت کی جھگی حکومتی سے پہلے ہی اس پر مکانات تعمیر کر لئے ہیں۔

۳۔ حکومت اور ہستی کے رہنے والے ایک دوسرے سے اپنے لیڈروں یا نچلے درجہ کے دربار سے براہ راست یا سیاستدانوں اور اوسچے درجہ کے دلالوں کے ذریعہ رابطہ قائم کرتے ہیں۔ کم از کم کے۔ ایم۔ سی۔ کے لئے یہ نا ممکن ہے کہ وہ انفرادی طور پر ہر شخص سے علیحدہ رابطہ قائم کریں اس لئے ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ مقامی جماعتوں اور لیڈروں کے ذریعہ لوگوں تک پہنچیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا ہے ہستی کے رہنے والوں اور لیڈروں کے مذاقات ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔ کبھی یہ لیڈر صرف اپنے مذاہن کو معلومات فراہم کرتے ہیں اور صرف ان کے مذاقات کی نمائندگی

کرتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ پیچیدگی کی بات ہے کہ جو کہ ایک سروسے کے درجہ معلوم ہوئی ہے، ہستی کے رہنے والے لیڈروں کے ذریعہ ترقی کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں، یہ معلومات نامکافی ہوتی ہیں (اس مقابلہ میں کہ جو کہ۔ ایم۔ سی۔ اخبارات اور ہمسایوں کے ذریعہ ملتی ہیں) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان حالات میں لیڈر حضرات ایک مقصد کے تحت طرفدارانہ معلومات فراہم کرتے ہیں اور اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ:

صاحب اختیار الزمان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک خلا میں کام کر رہے ہیں اور کبھی بھی لوگوں تک نہیں پہنچ سکیں گے، وہ صرف خاص خاص لوگوں سے رابطہ رکھتے ہیں کہ جو اپنے مذاقات کے علاوہ اور کسی کی نمائندگی نہیں کرتے۔

اس آخری عبارت میں اس رابطہ کا ذکر کیا گیا ہے جو حکومت اور سیاستدانوں کے درمیان "اوسچے اور نچلے درجہ کے دلالوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی قسم تبدیل نہیں کہ حکومتی لوگوں اور لوگوں کے درمیان رابطہ بغیر لیڈروں کے ہو سکے۔ لیڈروں اور الزمان میں بھی رابطہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان زیادہ طاقت حاصل کرنے کا مقابلہ ہوتا ہے، جیسا کہ لیڈری کے سلسلہ میں اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ایم۔ احمد نے رابطہ کی ان مشکلات کو جو الزمان اور سیاستدانوں کے درمیان ہیں، اس طرح سے بیان کیا ہے۔

- ۱۔ نوآبادیاتی دور کی ایک دوامیت کہ جس میں اقتصاد کی اعلیٰ حیثیت رہی "اور جس کی وجہ سے قوم پرست راہنماؤں کا ان کی جانب سے مخالفانہ رویہ رہا۔
- ۲۔ ذہانت اور تجربہ میں الزمان سیاستدانوں سے بڑھے ہوتے ہیں
- ۳۔ پاکستان میں سیاسی حکومتوں کا غیر مستحکم ہونا

جیسا کہ مصر درج بالا نکات سے واضح کیا گیا ہے اس میں اقتصاد کو فوقیت ملی ہوئی ہے، لیکن دیکھا جائے تو سیاستدان کہ جن پر کم آمد داری ہوتی ہے وہ اقتصاد سے زیادہ بہتر کام کر سکتے ہیں۔

ایک اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ عام ہستی کے رہنے والوں کے پاس اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ وہ حکومت سے رابطہ قائم کر سکیں۔ اس لئے ایک تنظیم اس رابطہ کی علیحدہ کو پورا کرتی ہے۔ اس لئے رابطہ جی پی اے اختیار کر لیتا ہے، اگر ہستی کی ترقی محکوم ہو تو صرف اس کے ذریعہ ہستی والے اپنے حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ حاصل کرنے کے لئے سرپرستی

کے نظام کو رد کیا یا منظور کرنا انتہائی ضروری ہے 'اس کو کس طرح سے منظور کیا جائے؟ اس کا جواب کچھ یوں ہے کہ "مصلحت سیاست اور منصوبہ بندی ہی میں نہیں بلکہ معاشی حالات میں فرائض و حقوق کی وضاحت سرمنشی کے نظام کو منظور کر دے گی۔"

بستی کے رہنے والوں کے حقوق تسلیم کرنے کے دور میں رہنما نکلتے ہیں۔ اس کے لئے رابطہ کے سلسلہ کو زیادہ بہتر اور عوامی بنایا جاسکتا ہے اور ٹرسٹ بورڈ 'پمپنگ' 'پریس' اور ریڈیو کے ذریعہ انہیں وضاحت فراہم کی جاسکتی ہیں اور بتایا جاسکتا کہ ان کے حقوق و فرائض کیا ہیں اور پھر ان کی معلومات کر کے جملہ تک جو اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ اس ذریعہ سے منصوبہ بندی کرنے والے اور انتظامیہ کے لوگ مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے کراچی میں یہ صورت حال نہیں اور رابطہ کے لئے درمیان تنظیم کے ذریعہ مقاصد حاصل کرنا وقتی طور پر ایک ذریعہ ہے۔

اس مثال کا لہجہ کچھ زیادہ پر امید نہیں ہے 'اور نہ میں پر امید ہوں' لیکن تھوڑا سا پر امید ہونے کے لئے مجھے ایک نکتہ پر زور دینے دیتے ہیں کی اور میں نے وضاحت کی ہے اس پر سب سے منصوبہ میں کہ جس میں کبھی آبادی کو ترقی دینے پر عمل کیا جاتا ہے 'اس کی خصوصیات ایک جنگل جیسی ہوتی ہیں' یہ شیطانی سازش نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی جنگ نہیں کہ جنگل کے قانون انسانی حقوق کے لئے بہتر نہیں ہوتے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کو دریافت کروں کہ جنگل میں بھی ایک نظام ہوتا ہے 'اور ایک مرتبہ جب ہم یہ جان لیں کہ کن حالات میں جنگل پھلتا ہے اور بڑھتا ہے 'تو پھر ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کے پھیلاؤ کو روکا جاسکے۔ مگر یہ ان لوگوں کا کام ہے کہ جو اس کی خواہش رکھتے ہیں۔